

www.Paksociety.com

میر کے ہمد م، میر کے دمسار

اقراء صغیر احمد

ڈاٹ کام

www.Paksociety.com

دن داخل رہا تھا۔ شام کے گلابی آنکھ کو دھیر دھیر نے سرنگی رنگ دیے تھے۔ داخل جانے والے دن ابھرتی شب کا لاپ یوں بھی دلوں کو نامعلوم سے احساس اندر دگی و اسی سے بوجھل کر ڈالتا ہے۔ اس کا دل پہلے ہی اس انجمنی جگہ و فضا کی اواسیسوں کی گہرائیوں میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

زندگی کے بائیس سال اس نے اپنے شہر میں گزرے تھے۔ شہر سے باہر جانے کا تصور بھی کبھی نہیں کیا تھا اور اب اچانک وہ کراچی سے ایبٹ آباد آگئی تھی۔ پچھلے دو سالوں سے اس کی زندگی بے درپے بہت سے حادثات سے دوچار رہی تھی۔ جس میں نمایاں ترین "حادثہ" اس کی شادی تھی اور دوسرا "حادثہ" شادی کے دو ہفتے بعد وہ بھری پُری سسرال کو چھوڑ کر شوہر کے ساتھ ایبٹ آباد آگئی تھی۔

بڑے سے آرامتہ چشموں و آیتاروں سے سجاہرتی حسن سے مالا مال یہ شہر بھی باسط کے سنگدلخ ارادوں و اہل فیصلوں میں کوئی چمک پیدا نہ کر سکے تھے بلکہ کراچی میں بے جی بھیا بھائی اور ماں جی کے ادب میں بیڈروم سے باہر اس کا مزاج بہت اچھا ہوتا تھا۔ بچوں کو چھیڑتے وقت خود بھی ہنس پڑتا تھا اور یہاں آکر وہ مزی سے بات کرنا ہی بھول گیا تھا بلکہ کبھی مخاطب بھی کرنا ہوتا تو بہت جنگ آمیز انداز ہوتا تھا۔ وہ خواہش کرتی اس سے بہتر ہے وہ اسے مخاطب ہی نہ کرے۔

اس نے بچہ کھڑکی کے شیشے سے چہرہ نکا کر باہر دیکھا تھا۔ سرنگی و گلابی شام کا آنکھ پھسل کر سیاہ شب کی رواں گیا تھا۔ دھند اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ باہر تاحد نگاہ دھواں ہی دھواں بکھر نظر آ رہا تھا۔ شیشہ برف کی سل کی مانند لگ رہا تھا جس سے نکا چہرہ بے حد شندک کے احساس سے لمحے بھر میں سن ہونے لگا تھا۔ سردی کی تیز لہر اس کے وجود میں سرایت کر کے ریزہ کی ہڈی میں سنناٹا ہٹ پیدا کر رہی تھی اور اس کے احساس و اعصاب پر تکلیف سوار ہونے لگی تھی۔ مگر وہ بے حس و حرکت یوں ہی کھڑی رہی خود کو اذیت دینا اس کو اچھا لگنے لگا تھا۔ دن بھر میں ایسے کئی مشاغل تھے اس کے جن کی حد تک پہنچ کر اسے محسوس ہوتا کہ اب بس وہ لمحوں میں ان کانٹوں بھری زندگی سے چھٹکارا لے لے گی۔ اس طرح خود بھی شاید سکون پالے گی اور باسط کو بھی اس سے چھٹکارا مل جائے گا۔ یہی تو اس کی دلی مراد تھی لیکن ایسا کبھی بھی نہیں ہوتا تھا۔ عین وقت پر موت خود اسے زندگی کی جانب دھکیل دیتی تھی۔ موت بھی شاید اسے پسند نہ کرتی تھی۔ باسط کی طرح وہ بھی اس کے لیے ناقابل برداشت و قبول تھی۔

شیشے سے چہرہ نکا نے وہ تہیہ کیے کھڑکی تھی۔ آج آخری سانس تک وہ یہاں سے نہیں ہٹے گی۔ شیشہ آستانہ ہوتا جا رہا تھا کو یا باہر کی تمام کمر بولیں ہوا میں اس میں محسوس ہو گئی ہوں۔ رواں دروازہ سردی کی شدت سے کچھ لگا تھا۔ رگ و جاں میں سنناٹا ہٹ بڑھنے لگی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے دروازہ شریف و کلہ طیبہ کا زیر لب ورد کرنے لگی۔ "بہتر اگر زندگی سے اتنی ہی بیزار رہتی ہو تو شادی سے قبل ہی کیوں نہ مر گئیں؟ اب مرنے کو مجھے پھنسلنا چاہتی ہو۔" اس نے ایک جھٹکے سے پردہ اٹھ کر دیکھا پھر جس طرح وہ بے آواز کمرے میں داخل ہوا تھا اسی طرح چلا گیا تھا۔

دریشتل ہوئے احساسات کے ساتھ اپنی ناکامی پر سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ ایک بار پھر وہ ناکام ہوئی تھی۔

"مرنا آسان نہیں ہے۔ موت اتنی آسانی سے نہیں آجاتی۔" اس نے کڑھ کر سوچا۔ پھر اسی لمحے اندر سے ایک صدا ابھری "مرنا آسان نہیں ہے۔ موت آسانی سے نہیں آتی تو عاقب کس طرح آنا فانا زندہ سے مردہ میں تبدیل ہو گیا؟"

وہ مضطرب سی کھڑی ہوگئی۔ آہ و فغاں کا طوفان اس کے اندر بھرنے لگا۔ "عاقب بچا جان چچی اور داوی جان ایک سال کے اندر پھر تمام قومین کی آغوش میں جاسوے تھے۔ وہ ابھی لوگ تھے نیک تھے۔ تب ہی ان کے لیے آسانی تھی اور میں۔۔۔۔۔"

"کس کا سوگ منا رہی ہو۔۔۔۔۔ میں زندہ ہوں ابھی۔" وہ بلی کی چال چلنے والا شخص بڑے تیور و خست لہجے میں کہتا اندر آیا تھا۔ وہ بوکھلا کر کھڑی ہوئی تھی۔ چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

"وہ۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔"

"کیا میں خاموش۔" وہ اس کی بات قطع کر کے درشتگی سے گویا ہوا۔ اس کے انداز میں برہمی تھی۔

"گھر سے فون آنے والا ہے۔ ان سے اچھی فریٹش آواز میں بات کرنا۔ انہیں ذرا بھی شک نہیں ہونا چاہیے ورنہ کل ہی سب پہنچ جائیں گے۔ میری گردن تاپے کے لیے نور ابھی میں کسی سے بھی کوئی تعلق بھانسنے کے موذ نہیں نہیں ہوں۔ جا کر اپنا علیہ درست کرو۔" اس نے اپنے مخصوص چمک کھیر انداز میں کہا۔

دریشتل کپڑے بدل کر آئی تو اسی وقت فون کی بیل بج اٹھی تھی جو باسط نے رسیو کیا۔ رسی دعا سلام کے بعد وہ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ اسی وقت اس کے پر سکون و مقلقتہ لہجے سے کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ ایسے مہذب و نرم و ملائم لہجے میں کسی کے لیے فراقوں کے اندوھے پھنکارتے ہیں۔ تدریج و تھیک کی بارش کی جاتی ہے۔

"پترا کیسی ہوا؟" باسط نے رسیو دے پکڑ لیا تھا۔ دھری جانب سے بے جی کی پشیمت آواز پھر اس کے دل کو گدگد کرنے لگی مگر وہ کسی مستعد چوکیدار کی طرح اس کے قریب کھڑا تھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں بے جی! آپ سائیں کیسی ہیں؟"

"میں ٹھیک نہیں ہوں پترا بلکہ کوئی بھی ٹھیک نہیں ہے۔"

"کوہ کیا ہوا ہے بی! سب خیر بہت تو ہے نا؟"

"گو ہم سب کا دل اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ پترا بہت یاد آتی ہے تیری۔ تیرے ساتھ گزارے پندرہ دن پندرہ صدیوں کی طرح لگتے ہیں۔" بے جی کے لہجے میں اس کے لیے ستائش و فخر تھا۔ آواز خوب قریب کھڑے باسط تک پہنچ رہی تھی۔

"ہم سب بہت شکر کرتے ہیں اپنے رب کا اس نے ہمیں ایسی ہی بھوئی بخشی ہم چاہتے تھے۔" بے جی کی لبر شکر آواز پر باسط کے چہرے کے ہر زوایے سے بے انتہا کیندگی و ناپسندیدگی واضح ہونے لگی تھی۔ بے جی کے بعد ماں جی بھیا بچوں نے بات کی وہ سب ہی اس کی بات کے گرویدہ تھے اسے یاد کر گئے تھے۔ باسط کا موڈ بری طرح آف ہو چکا تھا۔ یہ سب اس کی خواہش کے برخلاف تھا۔ بھائی سے بات کیے بنا بھی وہ دھب دھب کرتا وہاں سے چلا گیا۔

"تم ٹھیک ہونا اور بیٹا؟" بھائی کے انداز میں نظر تھا۔

"جی بھائی جان! مجھے کیا ہونا ہے۔۔۔۔۔ بڑی سخت جان ہوں۔"

"گد تھیں سخت ہونا بھی چاہیے۔" جو باو بھی کھلکھلائی تھی۔ "یا سطر کمرے میں نہیں ہے؟" کن کے انداز میں یکجہت تجویز آتی۔

"نہیں۔ وہ بیڈروم میں ہوں گے۔"

"منزہ مارٹنس سے واپس آگئی ہے۔ کچھ دنوں قبل اس کے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔ اب وہ یقیناً باسط سے رابطہ کرے گی یا شاید پہلے ہی کر چکی ہو تو اس کا بھرپور نہیں ہے۔" ان کی آواز میں اضطراب و تشویش تھی۔ وہ خاموش رہی۔

"باسط پر نگاہ رکھنا جلد از جلد اس پر اپنی محبت کی گرفت مضبوط کر ڈالنی چاہت کی زنجیروں میں اس طرح جکڑو کہ وہ منہ ہر طرف دیکھنے کی بھی سعی نہ کر سکے۔" بھائی اسے کافی دیر تک مفید مشوروں سے نوازتی اور سمجھاتی رہی تھیں۔

سسرال کے معاملے میں وہ بہت خوش نصیب تھی۔ بزرگوں سے بچوں تک اسے پیار و محبت حاصل تھا۔ فخر و اعتماد حاصل تھا۔

سسرال کے برعکس معاملہ باسط کے سوئے کا جس کے نام کے ساتھ شملک ہو کر وہ سسرال آئی تھی۔ اس نے اسے پہلی شب ہی ٹھکرایا تھا۔ بے وقعت و بے حیثیت کر ڈالا تھا۔ قبل اس کے کہ وہ بچوں کی بھول بھلیوں میں گم ہوتی۔ روزانہ کھلا پر فوم کے سمور کن چھوٹوں کے ساتھ بلیک ٹھری ہیں سوٹ میں کھڑا کھڑا رنگ سکے سے تیار وہ مائے کھڑا تھا۔ "بھائی سے اتنی دیر کیا باتیں ہوئیں؟" گویا یہاں نہ ہوتے ہوئے بھی اس کی ماتیں بہیں تھیں۔

"وہ خیر بہت دریافت کر رہی تھی۔" اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔ دریشتل کے انداز میں ایسی کوئی بات تھی جو اسے چڑھاتی۔

"میں جا رہا ہوں۔ گیٹ لاک کرلو۔" لکھا پہلی بار ہوا تھا۔ یہاں آئے کے بعد وہ پہلی بار گھر سے باہر نکل رہا تھا وہ نہ افس سے آنے کے بعد کچھ وقت وہ ٹی وی دیکھتے ہوئے گزرتا پھر سونے تک کمپیوٹر کے کی بورڈ اور ماؤس پر اس کی انگلیاں متحرک رہتی تھیں۔

"منزہ! گئی ہے شاید باسط سے اس نے رابطہ کر لیا ہو۔" بھائی کی سرکشی اس کے کانوں میں کوئی پھر اس کی یہ لگ سک سے تیاری اور خلاف معمول وہ آگئی گیٹ پکڑے ہاتھ لہجے پھر کولرز کا کھڑا رہوئے تھے۔ باسط باہر نکلتے ہوئے رک کر گویا ہوا۔

"انتظار مت کرنا۔" وہ کانٹیں سیدھا چلا گیا۔

وہ گیٹ لاک کر کے کتنی دیر تک اس سے ٹپک لگائے کھڑی رہی۔ "انتظار مت کرنا۔" یہ جملہ کسی مرد کے لیے کہہ دیئے کتنے آسان ہیں جب کہ عورت کا دوسرا نام ہی صبر و استقامت و انتظار ہے۔

رات پوری طرح ماحول پر چھا رہی تھی۔ سردی کی شدت میں بھی پوری طرح اضافہ ہو گیا تھا۔ وہ بیڈروم میں جلی آئی جہاں باسط بیٹھ کر گیا تھا۔ ماحول میں راحت آمیز حرارت در آئی تھی۔ وہ گہری سانس لیتی ہوئی یا تھر دم کی طرف بڑھ گئی۔ عشاء کی نماز کا وضو ہونے کے لیے اس نے آستین فولڈ کیں۔ سفید ہاتھوں پر سرخ مہندی کے دلکش نقش و نگار رنگ ایسا ہی تھا گویا آج ہی مہندی رچائی ہو۔ انہیں یہاں آئے وقتوں سے زائد ہو گئے تھے۔ آنے سے چند گھنٹے قبل بھائی نے زبردستی مہندی لگائی تھی۔ ان کے خیال میں بی بی نے مہندی سے ہی دلہنیا پاتا ہے۔ دو ہفتے گزر جانے کے بعد بھی اس کی مہندی معمولی سی پھیل نہ پڑی تھی۔ مہندی پر بھی اس کی اداس آنکھوں میں ماضی کی جھلکا ہٹ ابھری تھی۔



"میں نے پورا بیٹا نے ساتھ مہندی لگائی تھی۔ میری مہندی کب کی وصل دھلا کر صاف ہوگئی اور اس کی مہندی ابھی تک ایسی ہی ہے۔ نہ معلوم کیسا بات ہے اس کی مہندی کا رنگ بھی بڑا گہرا آتا ہے۔" منہ اس کے مہندی لگے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے رشک آمیز لہجے میں کہہ رہی تھی۔ قریب ٹیٹھی داوی جان نے کہا۔

ایسی ہی کہ سسرال، بہت محبت کرنے والا ہے اور خاص کر میرے لیے۔

تو قریح سارا دن باسط گھر میں ہی رہا تھا اور اسے معلوم بھی نہ ہو سکا تھا کہ وہ ہر لمحہ اس کی پر تحسین نگاہوں کے حصار میں رہی تھی۔ رات کو خواب میں بھی اسے عاقب ہی نظر آ رہا تھا۔ شادی کا گھر تھا۔ ہمارے رات کی تیاری شروع ہو چکی تھی۔ ہر بھائی کا ہاتھ بٹہ لپکا بنے کا رہیں بیٹھنا چاہتے تھے مگر چانی اوپر ان کے کمرے میں رہ گئی تھی۔ وقت کے پابند تیار جان کا غصہ عروج پر تھا۔ ہر بھائی کے دوست اور دوسرے دوستے دلہن کی بازی کے علاوہ فائزنگ کر رہے تھے کہ آج کل ان فضولیات کے بغیر خوشیاں ادا ہو رہی تھیں جاتی ہیں۔ اس وقت بھی یہی سب ہو رہا تھا۔ وہ اوپر جا رہا تھا۔ وریشا بچے اتر رہی تھی۔ اس وقت اس کی سچ و سچ فریاد تھی۔ ڈرامک پرل شرارہ سوٹ پر گولڈن فینس کام تھا۔ ہر رنگ چوڑی نور بہارت سے کیے گئے میک اپ میں اس کا خونخیز حسن دوا آئندہ نظر آ رہا تھا۔

”وہ... چشم بدور... لگتا ہے سارا میک اپ تم پر ہی ختم ہو گیا ہے۔ لیکن کے لیے کچھ میک اپ چھایا بھی ہے یا نہیں...؟“ وہ اسے پر شوق نظروں سے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

”یہ کون سا طریقہ ہے تعریف کرنے کا؟ سیدھے تعریف نہیں کر سکتے تھے۔“ وہ منہ بنا کر بولی۔
 ”اوپر سے چانی لے کر آ جاؤں پھر دل کھول کر تعریف کروں گا۔“ تا چانی کے غصے کا خیال آتے ہی کہتا ہوا اوپر کی جانب دوڑا تھا۔
 ”چانی اوپر سے ہی پھینک دو۔ ہم تمہارے ساتھ ہی جائیں گے۔“
 ”میرے پاس نام نہیں ہے فالٹو لوگوں کو لے جانے کا۔ اگر تم تمنا چلتی ہو تو ٹھیک ہے۔“ وہ ہنستا ہوا کہتا ہوا۔
 ”تمہارے ساتھ میں تمنا جاؤں گی۔ منہ دھو رکھو۔“

”سوچ لو... ورنہ ساری زندگی یاد کروں گی۔“ اس کے شوخ لہجے میں ایسا کوئی احساس ضرور تھا جس نے لمحے بھر میں وریشا کو سہا دیا تھا پھر وہ شانے جھکتی ہوئی نیچے اترنے لگی۔
 ”رکویا رات میں چانی دے کر آ رہا ہوں۔“ وہ اسے رکنے کا اشارہ کر کے بھاگتا ہوا اوپر گیا تھا۔ ہر گے کمرے سے چانی لے کر میرس سے نیچے جھک کر ہر سے چھوٹے عامر کی طرف اچھالی تھی اور وہ پیچھے ہٹ ہی رہا تھا کہ فائزنگ کی زد میں آ گیا۔ کوئی سیدھی اس کی پیشانی میں گھسی جلی گئی۔
 لمحے بھر کو سماں ختم گیا۔
 وقت کی گردیں رک گئیں۔

پھر بہت سارے منظر کیے بعد دیگرے بدلتے گئے۔ خون سے لت پت و بونڈ کفن میں لیپٹا اس کا زرد چہرہ، اگر تیلی کا نور کی خوشبو، گلاب کے پھول... آجیں، سسکیاں، آنسو...
 وہ جتنی ہوئی اٹھ بیٹھی تھی۔

”کیا ہوا؟“ باسط اس پر جھکا ہوا پوچھ رہا تھا۔
 ”عاقب... عاقب...“ سانس اس کی دھوکئی کی طرح چل رہی تھی۔ خوابیدگی کی کیفیت میں پکار رہی تھی۔ باسط نے سیمپ روٹن کر کے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اسی طرح آنکھیں بند کیے دوبارہ لیٹ گئی تھی۔ باسط نے اس کی طرف سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔
 ہر اونٹن ملکی گیسو تنکے پر بے ترتیبی سے پڑے تھے۔ لائٹ بلسٹ میں اس کے خوب صورت چہرے کی زردی نمایاں تھی۔ سیاہ بالکین، چٹنی نظروں سے بڑھیں۔ وہ خواب کی کیفیت میں جس طرح مدھوش سے اٹھی تھی اسی بے خبری سے سو رہی تھی۔ وہ جھکا ہوا اسے غور دیکھ رہا تھا۔
 اس کے دل کی حالت زیر و زبر تھی۔
 اس کے شکوک کو یقین کی قبائل گئی تھی۔
 وہ ہماری رات ایک ہی فقرے کے گرداب میں ڈوبتا ابھرتا رہا تھا۔
 عاقب...
 عاقب...
 ”عاقب! کون ہے یہ عاقب؟“ ہماری رات جاگتا رہا سوچتا رہا حسد و رقابت کی آگ اس کے پورے پورے سگلے گئی تھی۔

بے جی کا فون آیا تھا۔ ان کا صبر تو تھا کہ وہ ایک چکر گرا بی کا لگا لیں۔ چھ ماہ ہو چکے ہیں انہیں ان سے دور ہوئے۔ ان کی تو باقاعدہ باسط سے ناراضگی کا اظہار کر رہی تھیں۔ بھیا بھائی کی پیار بھری نالید تھی کہ وہ جلد سے جلد آئیں۔ وریشا کو وہ ابھی بھی منہ سے بچنے کی ترغیب دینا نہ چھوٹی تھیں۔ وہ باسط سے منہ کے مسلسل رابطے و تعلق سے بے خبر تھیں۔ انہیں معلوم نہ تھا وہ ماں بیٹی اہت آباد میں مقیم ہیں لیکن کی مشاعرے باسط نے اپنا ترانہ راجت کیا دے کر دیا تھا اور وہ جلد از جلد شادی کی تیاریوں میں مصروف ہے۔ وہ سب ان باتوں سے بے خبر سمجھ رہے تھے کہ وہ وریشا کی محبت میں بھول گیا ہے۔ اس کے لیے حسین ترین لڑکی کا انتخاب کرنے کا مقصد یہی تھا کہ وہ بڑھ کر نہ ہو کر مارتا ہے اور حسن حسن کو... ان کو اس خوش فہمی اور اطمینان میں مبتلا کرنے والی وریشا تھی جس نے اصل حقائق چھپا کر انہیں اپنی اور باسط کی جھوٹی داستانیں سنائی تھیں اور انہیں فکر و خطر اب سے آزاد کر دیا تھا۔ وہ ایسی ہی تھی۔ سب کی فکر میں اور تکلیفیں اپنے دامن میں سمیٹ لینے والی۔ اپنے بدلے کی خوشیاں و راتیں دوسروں میں بانٹ دینے والی۔ گدا زل حساس طبیعت لڑکی۔

”یہ لیکن کے سامان کی لسٹ ہے۔“ وہ باہر نکل رہا تھا جب اس نے لسٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
 ”مجھے ایسی شاپنگ کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ میرے کو لیگ نے گھرواری کی تھی۔ اب وہ چھینوں پر ہے۔“ اس نے وضاحت دی تھی۔
 ”لیکن... سلمان ختم ہو چکا ہے سارا۔“ ان میں بتائے گئے لیے بھی کچھ نہیں ہے۔“ اس کے انداز میں فکر مند تھی۔
 ”میرے پاس نام نہیں ہے۔ ابھی جیولر کے پاس جانا ہے۔ سات میں ہوٹل سے لے آؤں گا۔ کل میرے ساتھ چلی جانا شاپنگ کرنے۔“ وہ تجلّت میں کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ وریشا دروازہ بند کر کے چن کی طرف بڑھ گئی۔ سنک میں بڑے سائے کے برتن دھوتے ہوئے اس کا ذہن باسط کے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔
 پچھلے چند دنوں سے اس کا رویہ ناقابل فہم سا ہوتا جا رہا تھا۔ کبھی بالکل خاموش ہو جاتا۔ کئی کئی دنوں تک اس کی بچیدگی و بے زاری عروج پر رہتی تھی۔ وہ اس سے انتہیزارہ واکٹر اکھڑا کرتا کہ زندگی تنگ پڑنے لگی یا پھر اس کی نگاہیں عجیب انداز میں اپنے اور گرد و محوس کرتی ہیں وہ کچھ کھوج رہا ہو، تلاش رہا ہو کوئی بے چینی کوئی سوال اکثر اس کے لبوں کے گوشوں پر چھڑ چھڑا کر رہا تھا۔ جس کو وہ کسی مصلحت کے تحت لبوں سے لوانہ کر پاتا تھا۔

نہ معلوم اسے کیا پریشانی تھی... کیا مسئلہ و پریشانی تھا جس نے اس کی راتوں کی تیندیں بھی اڑا کر رکھ دی تھیں۔ اس کا معلوم خطر اب میں وہ اپنی محبت اپنے جیون کو بھی بعض نواقات نظر انداز کر دیتا تھا۔ راتوں کو آنے والی منہ کی کا لڑی سیوند کرنا بلکہ سیل فون ہی آف کر دیتا تھا جب سے آکر اس نے وریشا کو تنگ کرنا شروع کیا تھا تب سے باسط نے اس سے باہر ہی ملنا جاری رکھا تھا۔ وہ گھر کی خواہش ظاہر بھی کرتی تو وہ کسی نہ کسی بہانے سے روک دیا کرتا تھا۔
 چھ ماہ کے عرصے میں پہلی بار اس نے اسے باہر لے جانے کی بات کی تھی۔ لیجو بھی خاصا مہربان و نرم تھا۔ کبھی بھی وہ اس انداز میں بات کرنے کا عادی تھا۔ آج وہ جیولر کے پاس جانے کا کہہ رہا تھا شاید اس کی شادی کی ڈیٹ قریب ہی تھی۔ وہ ان ہی سوچوں میں الجھی ہوئی برتن دھونے کے بعد سنک و دھو رہی تھی جب وہ وہاں داخل ہوا۔
 ”میرے خیال میں آج ہم شاپنگ کر لیتے ہیں جیولر کے پاس میں کل چلا جاؤں گا۔“ اس کی استعجابی نظروں کے جواب میں وہ کہتا ہوا۔
 موسم ملکی خشکی لیے ہوئے تھا۔

بازار میں کھلی دکانوں کے درو دیاروں پر ہلکی دھوپ گھڑی تھی۔ سورج کی کرنوں کی گرمائی اس ٹھنڈے ماحول میں سرور انگیز تھی۔ رائل دیو گرم سوٹ پر رنگین دھاکوں و شیشوں سے دیدہ زیب کام تھا۔ اس کی ہر رنگ چار اوڑھنے وہ سادہ چہرے کے باوجود بہت دلکش و متغیر نظر آ رہی تھی۔ باسط کی بے ساختہ نگاہیں کئی بار اس کے چادر کے بالے میں لپٹے باوقار و پاکیزہ چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔ وہ سوچ رہا تھا۔
 ”حسن بے حجاب متاثر کن ہوتا ہے یا حجاب میں رہ کر سحر انگیز؟“

سلمان کی خریداری میں باسط نے خاصی مدد کو روٹی۔ اس دوران کھانے کا وقت ہوا تو وہ اسے ایک ہوٹل میں لے کر چلا گیا۔ انہوں نے وہاں نہ صرف کھانا کھایا بلکہ وہ ڈنر کے لیے بھی کھانا پیک کر دیا۔

”وریشا۔ وریشا۔“ وہ ہوٹل سے نکل کر کار کی طرف بڑھ رہی تھی جب اس کے کانوں میں ثنا سا آواز گونجی۔ وہ ٹھٹھک کر رہ گئی۔
 ”وریشا! ٹھیک کا ڈیم ہی ہو۔ تمہیں کیا ہوا؟ تمہارا رنگ روپ تم کس کے ساتھ آئی ہو؟“ رمضہ وہیں اس سے پست گئی تھی۔ ساتھ ساتھ بڑی جبرانگی سے اس سے سوالات کرتی چلی گئی۔ بل اوکر کے آتا ہوا باسط انہیں ملتے دیکھ کر رگ گیا تھا۔
 ”اپنے شوہر کے ساتھ۔“ باسط کی طرف رمضہ کی پشت تھی۔ باسط بہت غور سے وریشا کو دیکھ رہا تھا جس کے چہرے پر اس لڑکی کو دیکھ کر مسرت و فکر کے سائے لرزاں تھے۔ آنکھوں میں عجیب سا خوف اتر آیا تھا۔ وہ بھی باسط کو دیکھ چکی تھی اور تعارف کروانا ہی چاہتی تھی کہ وہ بڑے پر جوش انداز میں کہتا ہوا۔
 ”مبارک ہو مائی ڈیر! عاقب بھائی سے تو مجھے ڈبل ٹرپ لیتی ہوگی۔ کہاں ہیں عاقب بھائی؟“ وہ اس کی نگاہوں کے تعاقب میں گھوم رہی تھی۔
 ”عاقب بھائی۔“ لیکن سامنے کھڑے خود و پیوند ستم اجنبی شخص کو دیکھ کر اس کے مسکراتے لب یک دم بجھ گئے۔ آنکھیں حیرت سے ابل پڑی تھیں۔
 ”یہ باسط کامرہن ہیں میرے شوہر۔ یہ رمضہ ہے میری کلاس فیلو اور بیسٹ فرینڈ۔ شادی کے بعد کینیڈا چلی گئی تھی۔“ بہت بروہاری و قہقہے سے وریشا نے دونوں کا تعارف کر دیا تھا۔ رمضہ کا دھوواں چہرہ متغیر ہوئی رنگت اس کے دل پر گزرتی قیامت کی عکاسی تھی۔ خود اس کے اندر بھی بھیا تنگ و متغیر ہی پھیلی ہوئی تھی۔ بول اس طرح سرسراہ رمضہ سے ملاقات دوسرا جس طرح عاقب کا نام لے کر اس کا پکارنا۔ باسط کو دیکھ کر مری ایکٹ کرنا۔ وہ عاقب کے اس دکھ کو بھول گئی تھی جو رمضہ کو دیکھ کر از سر نو میدان ہوا تھا مگر

ساری رات اس نے جس ٹینشن میں گزار دی تھی اس کو کھانے پر بے چارہ گھر سے کھل گیا تھا۔ سب من کر اس کا کیا حال ہوا ہوگا؟ وہ متوجہ ہی نہیں رہی تھی۔ کئی گھنٹے گزر جانے کے بعد بھی اس کے آنسوؤں کی روانی کم نہ ہوتی تھی۔ اس کے ذہن میں ارمہ کی آواز گونج رہی تھی۔

”مرد خود خواہ کنفی ہی غلاظت میں تھڑے ہوں مگر اپنی شریک حیات کے متعلق معمولی سی بات برداشت نہیں کر سکتے۔ ان کا ظرف بہت کمزور ہوتا ہے۔“ باسط کے کل سے اب تک کے سروخا موش رویے نے رمدہ کی بات کی تھدیت کی تھی۔ رات گئے وہاں تھا۔

”کہاں چلے گئے تھے آپ؟“ باسط دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو وہ جوانہ لڑکیوں و عورتوں میں ادھ مری ہو چکی تھی۔ اسے سامنے دیکھ کر بے اختیار اس کے بازو سے پٹ کر رو پڑی تھی۔

”لمسوس ہو رہا ہے میرے زندہ واپس آنے پر۔۔۔۔۔“ وہ اس کی گرفت سے بازو چھڑا کر تڑپا رہی تھی۔

”یہ۔۔۔۔۔ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟“ اس کی آواز کا پتی ہوئی تھی۔

”آج کچھ بکایا بھی ہے یا سوگ مناتی رہی ہو؟“ نکھرے بال ممکن اودھاس سرخ بے خوابی ظاہر کرتی مشتعل آنکھیں زبان سے شعلے برساتا وہ شخص آتش نشاں بنا ہوا تھا۔

”کس کا سوگ؟ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟“ وہ کا پتی آواز میں بولی۔ جو اب اس کے چہرے سے پتہ چلا کہ اس کی نگاہیں اس کی نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے لفظ لفظ چبا کر کھ رہا تھا۔

”میری ساتھی بے اثر نہیں ہیں میری بصارت کام کرتی ہے۔ میں تمہارے کل سے آگاہ ہو چکا ہوں۔“ وہ کچھ وقف کے لیے خاموش ہوا تھا۔

”تم نے مجھ سے فراد کیا۔۔۔۔۔ پھیلانا ماضی اور اپنا داغ دار کر دیا۔“ اس نے کہا۔

”باسط صاحب! یز! آپ نے سب سن لیا ہے تو یہ بھی سن لیا ہوگا کہ آپ جو سوچ رہے ہیں وہ بالکل غلط ہے عاقب۔۔۔۔۔“

”بہت سن چکا ہوں تمہارے منہ سے تمہارے عاشق کا نام۔ دن تو تم اس کی یادوں میں بسر کرتی ہو۔ اتوں کو خوابوں میں بھی اسے پکارتی ہو۔ مجھ سے بڑا بے غیرت کوئی نہ ہوگا جو تم جیسی عورت کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوں جو ساتھ میرے بے گریبا دوں میں دوسروں کی رہتی ہے۔“ وہ اس وقت شقی القلب و جنگ نظری کی بلقی میں گرا ہوا سنگ دل لگ رہا تھا۔ شدید اشتعال میں وہ محسوس بھی نہ کر رہا کہ کتنی نازیبا زبان استعمال کر رہا ہے۔

”آپ نے صرف اپنے مطلب کی بات سنی اور چلے گئے اور اب اپنی پست ترین ذہنیت کی عکاسی کر کے میرے صاف و شفاف ماضی کو گڑا لود کر رہے ہیں۔“ عورت ہر دکھ ہر مہم ہر تکلیف برداشت کر سکتی ہے مگر اپنی پاکبازی و عصمت کی اعلیٰ چادر پر رسوائی یا شک کی محسوس ہی گرد بھی اسے غیر بنا دیتی ہے۔ ورنہ بھی اس کی بہتان آمیز گفتگو برداشت نہ کر سکتی تھی۔

”کواس بند کرو۔ میں خود بخود خود کو تکلیف دینا پہ شادی کی پہلی شب جو تمہارے ساتھ رہنا و گیا۔ ہر وقت تمہاری تو جین و ذلیل کی اور پھر یہاں لا کر رہنے پر کچھ عرصے بعد ہی میرے ضمیر نے مجھے جھجھوڑنا شروع کیا کہ اس صابر و تابعداری لڑکی کو کیوں تم گھر والوں کی زیادتی کی سزا دے رہے ہو؟ تمہاری خاموشی اخذ مت گزاری کی بھی لالچ کے بغیر یہ خیال رکھنا ہر کام بتا کہے گنا اور اس پر مستزاد گھر والوں کی ہر روز کی تعریفیں کی مثبت کے مظاہروں نے غیر محسوس طریقے سے مجھے تمہارے متعلق سوچنے پر راجب کر دیا تھا۔ میں جو شروع شروع میں تم سے بھاگتا تھا۔ تمہاری صورت سے چپ تھی مجھے پھر میں محسوس کر لے گا۔ اس میں مجھے نام گز کرنا دشوار لگنے لگا ہے۔ میرے اندر جلد سے جلد گھر بھاگنے کی خواہش رہنے لگی تھی اور گھر آ کر میرا ہر جانے کو دل نہیں کرتا تھا۔ چوری چوری میں تمہارا مشاہدہ کرنے لگا کہ جو تبدیلی میرے اندر برپا ہو کر رہی ہے اس نے تمہیں بھی متاثر کیا ہے یا نہیں۔۔۔۔۔“

چھ ماہ کی بھڑاس آج اس کے سگتے لہجے سے عیاں تھی۔

”مگر مجھے مایوسی ہوئی۔ تمہارا انداز وہی تھا کسی رو بوت کی طرح جذبات و احساسات سے عاری وجود۔ پاٹ چہرہ ہو بے جان تم کسی مشین کی طرح اپنے فرائض کی تکمیل میں سرگرداں رہتی ہو۔ پہلے میں نے خیال کیا شاید میرے بے سرو بیے نے تمہارا دل توڑ دیا ہے۔ تم مجھ سے بدظن ہو گئی ہو اور میں اپنے رویے کی غلطی کرنا ہی چاہتا تھا کہ بالکل تائیں نے تمہاری اہی سے ہونے والی تمہاری گفتگو کی جس میں تم نے ان سے یہ کہہ کر ریسور کھ دیا تھا کہ تم ان کے لیے مر چکی ہو۔“

وہ ایک کے بعد ایک انکشاف کر رہا تھا۔

”اس وقت میرے دل میں تمہاری جانب سے بدگینی نے جنم لیا تھا کیونکہ کچھ ایسے فقرے میں نے اسی طرح جذباتی انداز میں بے نی سے کہے تھے جب انہوں نے منہ سے شادی کی خواہش پر میرا بیجاٹ کر دیا تھا۔ تمہاری لائق و بے نیازی کا ایک سرالامتو رفتہ رفتہ ساری گز جس کے گئے تھے۔ یکے بعد دیگرے بہت مواقع مجھے ملے۔ تمہیں مجھنے کے منہ کی آمد میری اس سے شادی کا پلان راتوں کو اس کی کا فز سبب پھر کی صورت کی طرح دیکھتی رہیں مٹی رہیں۔ میں منتظر رہا کہ تم مجھے منہ سے ملنے سے روکو۔ اس کی کالز آئیں تو میں اٹھا کر پھینک دو۔ مجھے شادی نہ کرنے دو۔۔۔۔۔ مگر تم نے میری ہر سوچ کی نفی کی گھر والوں کو بھی جھوٹی تسلیاں دیتی رہیں۔ یہاں مجھے پوری آزادی منہ سے ملنے کی دی۔ سنا تھا عورت مرد کے مقابلے میں معمولی سی بھی شراکت برداشت نہیں کر سکتی۔ منہ کا لقمہ تقسیم کر سکتی ہے شوہر نہیں۔۔۔۔۔ تم نے گھر والوں کے دباؤ میں آ کر مجھ سے شادی تو کر لی مگر مجھے مجازی خدا کا رعب و مقام ندے سکے۔ کچھ دن قبل تمہیں خوب میں عاقب عاقب پکارنے کو کچھ کر میرے غلب کو آدھا تقسیم کر دیا تھا۔ کل سے آج تک اس پر یقین و صداقت کی پکی ہر لگ گئی ہے۔ مردانہ بے وفائی پر۔۔۔۔۔ ایک طوائف کو معاف کر سکتا ہے مگر ایک ایسی لڑکی کو نہیں جو علی و حشر خاندان کا لیبل جا کر کسی کی بیوی بنی ہو۔ یہ ٹکٹ ہے صبح ڈرائیور نہیں ایئر ہورٹ چھوڑ آئے گا۔ کراچی جا کر اپنے منہ سے بے نی کو اپنے ماضی کی داستان سنا۔ بہت ناز بے انہیں اپنی عزت و ارعاندانی بہو پر۔ صبح میرے شخصے سے قبل یہاں سے چلی جانا ورنہ۔۔۔۔۔“

وہ سارا زہر اگل کر ٹکٹ اور کئی ٹوٹوں کی گڈیاں اس کی طرف اچھال کر لیے لیے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا۔ اس کی جانب دیکھے بنا جواتے بڑے الحرام اتنی بڑی گالی کو سن کر وہ بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی تھی۔



سلیپنگ پلٹر کھا کر وہ دن چڑھے تک سوتا رہا تھا۔ اٹھا تو دن خاما چڑھ آیا تھا۔ اٹھتے ہی بیڈٹی کی طلب بیدار ہوئی تھی۔ بے ساختہ نگاہ سائیز ٹیبل پر لگی جہاں پر صبح بھاپ اڑا تا کہ اس کے لیے موجود ہوتا تھا۔ وہ بتا کہ اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھی اور اسی سبب اس کا دل نرم ہو چکی تھی۔ اس کا تصور آئے ہی اس کے ہونٹ نورت آمیز انداز میں سکڑ گئے تھے۔ وہ اٹھ کر واش کمر کی طرف بڑھ گیا تھا۔ وہاں جا کر اسے پھر جھٹکا لگا تھا۔ مگر اس کے استری شدہ سوٹ سے خالی تھا۔ وہ جھجھلاتا ہوا ہر آگیا تھا۔ ڈائریوب سے سوٹ نکالنے میں اس کا زہر دشواری ہوئی تھی۔ حالاں کہ تمام سوٹس استری شدہ ہنگ ہوئے تھے مگر اسے عادت کہاں رہی تھی۔ ورنہ اٹھنا ورنہ کام کرتی تھی۔ ہاتھ لے کر آتا تو ڈریسنگ ٹیبل پر رکھی ہر شے اسے خود سے دور محسوس ہو رہی تھی۔ ایک ایلیٹی خوشبو نکھیرنا خاموش وجود اس کی نگاہوں میں متحرک رہا تھا۔ وہ ہر گز اس کی چٹاریوں میں اس طرح مدد کرتی تھی۔ وہ اس کے بریف کیس میں فاکلز اور دیگر چیزیں رکھتی تھی۔ روت لاپرواہی سے وہ اپنا سامان اٹھرا اٹھرا رکھ دیا کرتا تھا۔ وہ یاد سے اس کے لباس کی جیسوں سے منتقل کرتی تھی۔ ٹیبل پر اشتہا انگیز خوشبوؤں سے مہکتا ناشتہ اسے اپنی جانب راغب کر لیا کرتا تھا۔

وہ غویوں کا مرقع تھی۔ ہر کام بڑی بھرتی و یلقہ بندی سے کرتی تھی۔ اس کے ہاتھوں کے پکے کھانوں میں اتنی لذت ہوتی تھی کہ وہ چائے بھی باہر بیٹا پسند نہیں کرتا تھا۔ آج کو یا سب ختم ہو گیا تھا۔

وہ تیار ہو کر آیا تو گھر میں شانے بین کر رہے تھے۔ ورنہ ہر دو دیوار سے پٹ پٹ کر لودہ گناں تھی۔ کل تک جو خاموش وجود کے دم سے یہاں جہازوں کے پھر اسن لہجائے تھے۔ اب وہاں خزاں اپنا خاک آلود سراپا ڈالے بیٹھی تھی۔

وہ دل کی حد اؤں کو قدموں تلے کچل کر لاؤنچ کی طرف بڑھ گیا۔ اندر ٹیبل پر اس کے ٹوٹوں کی گڈیاں یوں ہی پڑی تھیں۔ البتہ ٹکٹ عائب تھا۔

”گیٹ لاسٹ۔“ وہ تصور میں چھالتے اس کے سراپے سے مخاطب ہوا۔ گیٹ لاک کر کے باہر آیا تو چوکیدار نے بتایا۔ بیگم صاحبہ ایئر پورٹ چلی گئی تھیں۔ اس کا ذہن بے شمار انتشار و اضطراب کا ڈھکڑا تھا۔ اندر اتنی وحشت و بے سکونی پھیلی ہوئی تھی کہ گدگد سے چیختی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ دل میں اتنا اشتعال و جنون تھا کہ پوری دنیا کو آگ لگانے کو دل چاہ رہا تھا۔ کتابت و سرکوں پر مرکزیت کرتے ہوئے گزارا تھا۔ دل کو چین و قرار کی طور نہ ملا تو وہ منہ کی طرف آگیا جو اسے دیکھ کر پھولوں کی طرح کل اٹھی۔

”کل گئی فرصت؟ نہ کال ریسو کرتے ہو نہ گھر پر ملنے ہو۔ واجت میں باہر سے ہی کہہ دیتا ہے۔ صاحب گھر پر نہیں ہیں۔“ کہاں ہو تم؟“ بڑے ناز سے اٹھا کر وہ اس کے قریب بیٹھ گئی۔ سیاہ ویلٹ کا چست لباس امپورٹ خوشبوؤں سے مہکتا وجود اور خوب صورت چہرے پر نازہ میگ اسپ کی سرخیاں۔ انداز میں ہلاکی و اٹکی والہانہ پن اس کا ہر انداز و لبائی و رعنائی سے بھر پور تھا۔

”یلتیز چائے پلو آؤ۔ اپنے ہاتھوں کی دھوئی۔ ہر میں درد ہو رہا ہے۔“ باسط آئی کو سلام کر کے اس سے مخاطب ہوا۔ اس کے شکوے از خود نظر انداز کیے تھے اس نے۔

”چائے۔۔۔۔۔ اور میں اپنا دل اپنے ہاتھوں سے؟“ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔

”میں نے تمہیں کوئی جوک نہیں سنایا۔ چائے کی فرمائش کی ہے۔“ آگ اس کے اندر پہلے ہی بھڑک رہی تھی۔ قریب بیٹھی منہ کی ہسی اور آئی کی سکر ایٹ نے اس کو اور تپاؤ الاہہ بخیر کی سے کو یا ہوا۔

”باسط بیٹا! منہ مت کرنا۔ منہ نے ایک ہزن کو ہاتھ نہیں لگایا۔ لیکن میں کیسے کام کیا جاتا ہے۔ یہ نہیں جانتی۔ تم اس سے چائے بنا لے کا کہہ رہے ہو۔“

”چلو باہر چلتے ہیں کسی فنکار سنگ سے ہوٹل میں چائے نہیں گے۔“ منہ نے اپنا سر میں بازو اس کے شانے پر رکھتے ہوئے لاڈ سے کہا۔

”واپس میں کھانا پیک کر واکر لے آنا۔ حرام خور ملازمہ نے آج چھٹی کر لی ہے۔“ اندر ڈال روٹی کھا کر میری بھوک نہیں مٹی۔ باسط بیٹے کا جو اور پستے سے بنا وہ اصلی گھی والا طوطہ ضرور لے کر آنا۔ کچھلی ورنہ منہ نے مجھے پھٹکھلا بھی نہیں تھا۔“

”توبہ! تو بہما اس قدر چھوٹی عورت ہیں آپ۔ کھا کر مرنے ہیں۔“ منہ کے اندر زہر باسط چپ نہ رہ سکا تھا۔

”یہ کس طرح بات کر رہی ہو؟ آئی ہے؟ اماں ہیں تمہاری بزرگ ہیں۔“

”تم نہیں جانتے ڈیڑھ ایس جاتی ہوں ان کی بزرگی۔“ اس کے انداز میں مڑھتا۔

”لو کے آئی! میں کل آپ کو طلوہ لادوں گا۔ اس وقت شاپ بند ہوتی ہے۔“

”سرسوئی وجہ سے مجھ سے ڈرائیونگ نہ ہو سکے گی۔ منزہ آج تم میری خاطر چائے بناؤ اور نہ صرف چائے بلکہ مکمل کوکنگ سیکھو۔ میں ہر روز بناؤں گا۔ اس کے کھانوں کو برواشت نہیں کر سکتا۔ تمہیں میری خاطر سب کرنا ہوگا۔“

”ارے تم مجھے بیوی بنا کر لے جانا چاہتے ہو یا پھر چین؟ کم از کم مجھ سے ایسی امید مت رکھنا۔ مجھے گھر کے کاموں سے الگ رہنی ہے۔ دم گھٹتا ہے میرا۔“ منزہ وریشا کو دیکھ چکی تھی کہ اس نے کتنی نفاست و سیلتہ مندری سے پورا گھر منجھالا ہوا ہے مگر اس کا خیال نہ تھا کہ باسط اس سے بھی ایسی توقع رکھ سکتا ہے اور اب اس کے خیالات نے دوئوں ماں بیٹی کو چنکا دیا تھا۔

”بیٹا! تم بھی کسی دنیاوی باتیں کر رہے ہو۔ اس دور میں تو غریب غریب بھی دو تین ملازم خوردہ کر لیتے ہیں اور تم تو اسے گریڈ کے آفیسر ہو۔ تمہیں نوکروں کو برواشت کی کیا کمی۔ ایک اشارے پر ملازمین کی لائن لگ جائے گی۔“

جواباً باسط کے بگڑتے بیرو دیکھ کر وہ کھسیا کر اٹھتے ہوئے بولیں۔

”آرام سے بیٹھو۔ میں بنا کر لاتی ہوں چائے۔“

”میں جا رہا ہوں رہے دیں۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”تمہیں بیٹا! ایسا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے پہلی بار کوئی فرمائش کی ہے تم نے اور یہی ہی جاؤ گے۔ تم بیٹھو نافٹ بنا کر لاتی ہوں۔“ اس کے اکھڑے اکھڑے رویے سے خطرہ محسوس ہوا تو وہ منزہ کو اشارے سے سمجھا گئیں۔

”تم یہاں لیٹو! ارنگ! میں سرواتی ہوں۔ دیکھنا کیسا سکون ملتا ہے۔“ اس نے بازو پکڑ کر اسے آغوش میں گر کا چاہا۔ وہ پیچھے ہٹ گیا۔

”وہ گاؤں تم تو ایسے دور بھاگتے ہو جیسے میں کوئی بلا ہوں۔ ہم میاں بیوی ہیں پھر تمہاریوں دور دور ہونا مجھے سمجھ نہیں آتا ہے۔“

”ہم میاں بیوی ہیں نہیں۔۔۔۔۔ ہونے والے ہیں یا دور لکھا کرو۔“

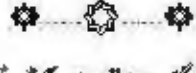
”یہ سوٹل اینکونٹیر صرف دکھاوے کی ہوئی ہیں ورنہ تم مجھے چاہتے ہو میں تمہیں پسند کرتی ہوں۔ ہمارے دل ایک ہیں۔“ انہیں ہر طرح کا انھیا حاصل ہے۔ ”وہ شانے اپکا کر ٹھوس لہجے میں کویا ہوئی۔“

”مجھے تم کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے یا تم مجھے سمجھ نہیں سکتی ہو۔“

”اوہ۔۔۔۔۔ کم ان ڈیڑھ ایس معلوم کسی باتیں کر رہے ہو۔ پلو باہر پلٹے ہیں۔ گھر بیٹھے بیٹھے اور ہوگی ہوں۔“ اسے سیریس دیکھ کر منزہ نے بات بدلی۔

”تم کہتی ہو تمہیں مجھ سے محبت ہے تو یہ کیسی محبت ہے جو تم میری صورت دیکھ کر میرے طاقتور ہونے دل کا اندازہ نہیں لگا سکتی ہو۔ مجھ پر جان ڈینے کی قسمیں کھانے والی۔ ایک کپ چائے بنانے کی قربانی نہیں دے سکتی؟ جو محبت کرتے ہیں وہ چہرہ دیکھ کر دل کا بھید پالیتے ہیں بنا کہے در غم سمجھ جاتے ہیں۔ تمہاری یہ کیسی محبت ہے؟ کسی انجانی چاہت ہے جو مجھے شناخت نہیں کر پارہی۔ میں کرب کی دھوپ میں بیٹا ہوں تمہاری پیار کی چھانوں کی آس میں آیا تھا اور تم مجھے بنا کہے اپنی کچے جارہی ہو۔“ پہلی بار اس کے دل میں منزہ کی جانب سے تنفر جا کا تھا مگر صرف سوچ کر رہ گیا تھا۔

آئی چائے لے آئی تھی۔ ماسٹر اور کپ چائے کی پتی اور چائے سے بد نما تھے۔ کپ کے کناروں پر پتی چپکی ہوئی تھی اور کچھ جھڑکے ماسٹر میں چپکی ہوئی چائے پر تیر رہی تھی۔ اس پر مستز کو کم پتی و کم دودھ والی بے رنگ چائے دیکھ کر ایک گھوٹ پڑے بغیر ہی واپس چلا آیا تھا۔



وقت جو کبھی اتنی سرعت و چھرتی سے گزرتا تھا کہ اسے اس کے گزرنے کا گمہ رہتا تھا۔ ان آٹھ دنوں میں بیویوں کو کسی راستے دے چکا تھا۔ وہ آفس سے چھٹیاں لے چکا تھا۔ عجیب بیزار ی و پشیمانی اس کی ذات کا گھبراؤ کر چکی تھی۔ وہ اپنی اندرونی کیفیت پر قابو نہیں پا رہا تھا جو اسے ان راستوں پر گامزن کر رہا تھا جس کو وہ دھنکار چکا تھا۔ گھوٹ مار چکا تھا۔ پہلی نظر میں وہ جس کو ناپسندیدہ قرار دے چکا تھا۔ دل کے نہ معلوم کون سے خفیہ تہ خانے میں وہ اس لمحے چھپ گئی تھی۔ وہ اس کو محسوس نہ کر سکا تھا جو گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ تناؤ و درخت بن گیا تھا۔ شدید طیش و اشتعال میں وہ اس جذبے کو چھلنے میں مصروف تھا اور مسلسل ناکامی کا شکار بھی۔ وریشا کی موجودگی میں کسی احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ اس کے وجود کا اتنا عادی ہو گیا ہے کہ اس سے دور رہنے کی خواہش کے باوجود وہ خود کو تنہا اور نامکمل محسوس کر رہا تھا۔ وریشا کو گئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ ان چند دنوں میں اس پر بے شمار احساسات و حقائق منکشف ہوئے تھے۔ اسے خود اعتمادی کا موقع ملا ضمیر نے نہایت فرض شناسی و دیانت داری سے اس کے طرز عمل اور وریشا کی ثابت قدمی و ہمدردی و استقامت کا موازنہ کر ڈالا تھا جب اسے ضمیر کے آئینے میں صورت دیکھتی پڑی تو وہ ششدر رہ گیا۔ منافقت و ریا کاری سے اس کا باطن سیاہ ہو رہا تھا۔ ذات کا ہر جتنی پہلو کردار کا ہر چھول اسے نظر آ رہا تھا۔ ضمیر کی صداقت لگ چکی تھی۔ وہ کبھی اسے میں سر جھکا کر اگڑے وقت کے منظر میں گم تھا۔

وریشا اور اس کی شادی کو کچھ ماہ سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ اس دوران کوئی دن ہی ایسا گزرا ہوگا جب اس نے اسے اپنی ناپسندیدگی کا احساس نہ دلایا ہو نہ بتایا ہو کہ وہ اس کی پسند نہیں ہے۔ زبردستی بے جی کی خاطر وہ اسے برداشت کر رہا ہے۔ عورت کی ان کتنی لاغر ہوتی ہے۔ یہ وہ بخوبی جانتا تھا۔ جان بوجھ کر وہ اس کی انا کو گھائل کرنا رہا تھا۔ عزت نفس کے پندار پر ضربیں لگانا رہا تھا اس لیے کہ وہ اس کے ٹھنڈے انتقام سے گھبرا کر پٹلی جائے، چھوڑ جائے اسے کبھی واپس نہ آنے کے لیے اور وہ سرخرو ہو جائے۔۔۔۔۔ اب وہ پٹلی گئی تھی تو اس کا دل بالکل کہیں نہیں لگ رہا تھا۔ اپنی ساری بے جی و بے نیازی یا داری تھی اور وہ ضمیر کے شکبے میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔

”تم جو خود کو اتنے بری سمجھتے ہو آؤ خود مختار زندگی گزارنے کے عادی ہو۔ اپنی من مانی کرنا تمہاری سرشت میں شامل ہے۔ کل منزہ تمہاری منزل تھی جس کی خاطر تم نے اس لڑکی کی قدم قدم پر امداد کی جس کو تم اپنا نام دے کر لائے تھے۔ آج منزہ کے تصور سے بھی تم الگ ہو کر تمہارا اس لڑکی کی یادوں میں گم ہے جس کی کل تک تمہاری نظروں میں کوئی وقعت نہ تھی۔“ وحشتوں و جنوں خیزیوں کے بادل جب چھپے تو اسے حواسوں پر پڑا ہوا بھی اٹھتا ہوا محسوس ہوا اور وہ نہایت غیر جانبدار داری سے اپنا تجربہ کر لے لگا۔

”تم جو ہر لمحہ وریشا کو یہ احساس دلاتے رہتے تھے کہ وہ تمہاری محبت نہیں ہے۔ تم ایک دن بھی یہ انکشاف برداشت نہ کر سکتے کہ وہ۔۔۔۔۔ بھی کسی سے محبت کرتی ہے کوئی اس کی زندگی میں بھی اتنا اہم رہا ہے۔ اس حقیقت نے تمہیں کتنی تکلیف دی تمہاری بھوک و پیاس نیند و آرام سب ہوا ہو گیا اور تم جو لوگوں میں بہت مہذب و مہذب سمجھے جاتے ہو اچانک ہی اتنے اچھڑکے طرف مائل ہو کر رہ گئے کہ جو زبان پر آیا نہ سوجھے سمجھتے چلے گئے۔ ذرا بھی تمہیں احساس نہ ہوا کہ اس لڑکی کے دل پر کیا گزرتے گی جو بہت قتل و بر دباری سے وہ سب برداشت کرتی رہی جو کوئی دوسری لڑکی ہرگز برداشت نہ کرتی۔ تم مرد ہو کر کم ظرف و کم حوصلہ نکلے ہو لڑکی ہو کر تم سے بلند ظرف و بلند حوصلہ نکلی۔ بے جی ٹھیک کہتی ہیں وقت پر کھرے کھوٹے کی پہچان لانا ہی کو بھی ہو جاتی ہے میں بھی ایسا ہی لاری تھا وقت پر نہ سے قبل سمجھا نہیں تھا۔

وریشا کی جدائی نے آنکھوں سے تمام حجاب اٹھا دیے ہیں تو منزہ کی قربت نے دل کی چاہت کو سمجھنے میں آسانی فراہم کر دی ہے۔ ان فوڈ دنوں میں گھر کی تہائی و دل کی وحشت سے گھبرا کر وہ بار بار منزہ کی طرف بھاگا تھا اور ممکن تھا کہ وہ اس وحشت و جنوں سے گھبرا کر منزہ سے شادی کر بیٹھتا۔ جس کو نہ معلوم جذبے کے تحت ہمتی کرنا آ رہا تھا کہ منزہ اور اس کی ماں کی حرکات و سکنات پوری طرح اس کی نگاہوں میں آگئی تھیں۔ منزہ سے اس کا اندیشہ بہت پرانا تھا لیکن گھر والوں خصوصاً بے جی کو یہ فیملی قطعی پسند نہ تھی۔ وہ کہتی تھیں۔ منزہ کی ماں کے چال چلن شروع سے ایسے نہیں ہیں کیونکہ وہ شریف گھرانے سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ کسی باپنے والی کی بیٹی ہے جس نے اپنے شوہر کو دھڑے آدی کے چکر میں ڈھروے کر مار دیا تھا اور اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے حق چھٹی گئی تھی۔ خاندانی نام و نود کو جان سے بڑھ کر اہمیت دینے والی ہے۔ جی کسی ایسی ماں کی بیٹی کو ہو جانے کے تصور سے بھی نا آشنا تھیں اور وہ ان دنوں اس کی محبت کی شدت میں اس حد تک مبتلا تھا کہ خاموشی سے کورٹ میرج کرنے پر رضامند ہو گیا تھا پھر نہ معلوم اس کی تقدیر کا فریب تھا یا بے جی و ماں کی دعاؤں کا اثر۔ اس ہلے و دھڑم کی جانب سے بنگا چلا گیا تھا جہاں سے واپسی میں خبر ملی کہ منزہ شادی کر کے بارشس میں جا رہی ہے۔ اس خبر سے جہاں اس کے دل کی دنیا تباہ و برباد ہوئی۔ وہاں گھر والوں کے خلاف دل میں ہدنگنی و بے جی کی فصل بھی لگ آئی تھی۔ اس کے خیال میں ایسا کرنے کے میں گھر والوں کا ہاتھ ہے کیونکہ منزہ اور اس کی ماں ان کی ناپسندیدگی سے واقف تھیں۔ بے جی نے اس کے لیے ایسی لڑکی کا انتخاب کیا تھا جو اعلیٰ عزت و خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور نہ صرف منزہ سے زیادہ خوب صورت تھی بلکہ خوب سیرتی میں بھی اس کا کوئی ثانی نہ تھا۔ بے جی کی خواہش اس نے ٹھوکر میں اڑا دی تھی اور گھر چھوڑ کر جانا ہی چاہتا تھا کہ ان کے ہارٹ ایک اور سیریس حالت نے اس کے تمام حوصلے و اشتعال بھلا دیے اور وہ ان کی زندگی کی بقا کے لیے یہ کروڑ ترین گھنٹ پی گیا اور ساتھ واضح بھی کر دیا تھا کہ وہ لڑکی صرف ان کی ضد کی وجہ سے اس گھر میں آئی ہے۔ وہ اس کو وہ مقام ہرگز نہیں دے گا جو منزہ کا حق تھا اور یہ کہ وہ اس سے کچھ نہیں چھپائے گا۔ اس نے ایسا ہی کیا تھا۔

لیکن جو بار وریشا کا کپڑا وائز اس کے ساتھ ساتھ گھر والوں کا بے حد خیال کرنا بہت کم وقت میں وہ سب کے دلوں پر راج کر رہی تھی۔ سب کی زبان پر اس کی تعریف و تحریف تھی جو اس کی خواہش کے برعکس تھی۔ وہ اسے لے کر اجب آباد چلا آیا تھا تا کہ اپنی فرحت و ناپسندیدگی کے ماحول سے اسے گھائل کر ڈالے اور وہ بھاگ جائے۔ منزہ نے شادی کے کچھ عرصے بعد ہی اس سے رابطہ کر لیا تھا اور اس انداز سے رور و کر شادی کرنے کی مجبوری بتائی کہ وہ قائل ہو گیا پھر اسے خبر ملی کہ منزہ کے شوہر کے انتقال کی جو روڈ ایکسڈنٹ میں ہلاک ہوا تھا۔ اب وہ ایب آباد آگئی تھی اور اس نے ہی اسے ریٹ پر کانچ لے کر لیا تھا۔ اس کے تمام اخراجات اسی کے ذمے تھے۔ وریشا کی مدد کے لیے اس نے ایک بھی ملازم نہ رکھا تھا جب کہ منزہ کی فرمائش پر چار ملازمین رکھوائے تھے۔ منزہ جو دور سے چمکتا سماعت نظر آتی تھی قریب جا کر معلوم ہوا وہ صرف بد نما ہو چکا تھا جس پر چمک دار پالش ہوئی تھی اور اب وہ پالش اتری تو شخصیت کی بد صورتی پوری عیاں ہو چکی تھی۔ وہ بار بار اس کی طرف بھاگا اور ہر بار پہلے سے زیادہ مایوس و بیزار ہو رہا تھا۔ راتوں کو دیر تک جاگنا دن ڈھلے پیدار ہونا ان کا معمول تھا۔ اکثر وہ ماں بیٹی کو معمولی معمولی چیزوں پر لڑتے دیکھتا تھا۔ یہ بات اس کے لیے نہایت حیرت اور نا سفاک آمیز تھی کیونکہ ان کے گھر میں یہ انداز نہ تھا۔ لیکن تو کوئی تھی نہیں بھائی کو بھی اس نے بے جی ماں جی کا بے حد ادب و احترام کرتے دیکھا تھا پھر وریشا بھی اس کی بہت عزت کرتی تھی۔

ایسی زبان درازی بوجہ تہذیبی کا بھی اس کے ہاں تصور محال تھا۔ ہر وقت نئی شے منظر رہتی تو آئی اس سے بھی دبا تھا۔ نگہ نظر آئیں۔ لوہڑی میں تیز کلر کے کپڑوں کو ریتاؤں گھسار میں وہ کسی باوقار عورت کے برعکس نظر آتی تھیں۔ پہلے وہ منظر کو گھٹ سے پک کیا کرتا تھا۔ لب ستوا گر میں جانا ہو تو معلوم ہوا وہاں عموماً کسی نہ کسی کا آنا جانا لگا رہتا تھا کوئی آئی کا کزن تھا، کوئی انکل کے رشتے والا کوئی منترہ کا سسرالی عزیز۔ وہ آتے تو رونوں قیام کر کے جاتے۔ اسے ان لوگوں کی آمد و رفت بری لگتی تھی مگر مرنا خاموش رہا تھا اور اس دوران حقیقت کھلتی چلی گئی کہ وہ جس کو پتہ سمجھ کر ٹھوکروں میں رکھ رہا تھا۔ وہ دراصل ایسا نابھ ہیرا تھا جو اس طوطا چشم دور میں ملنا مفتوحہ تھا اور جس کو وہ کل کائنات سمجھے ہوئے تھا وہ خوب صورت سراپ کے سوا کچھ نہیں تھی۔

”باسط! کیا ہوا ہے تمہیں؟ آخر کیوں مجھے پریشان کرتے ہو؟ پہلے ظالم سارا جہاں سے درمیان حال تھا۔ اب راستہ صاف ہے تو تم وہ گھر رہے ہو۔“ وہ اس کے سامنے آئی تھی۔ تاشی سوٹ پر چھری لٹیر بیڈری والے سوٹ میں تک سبک سے تیار تھی بھرے انداز میں جو گفتگو تھی۔

”تم میری شرائط انوار میں تمہاری خواہش پوری کروں گا۔“ اس کا انداز مختلف و سبک تھا۔ محبت و جنون مرد و بچہ چکا تھا۔

”نوے۔ تم یہ چاہتے ہو میں دھوئیں باور چین، چنگن بون تو بیٹا ممکن ہے۔ ایسے کام صرف وریشا کر سکتی ہے کیونکہ وہ ایسے گھٹیا کام کر کے تمہیں حاصل کرنا چاہتی ہے۔ تمہاری محبت پانا چاہتی ہے تاکہ تم اجرت کے طور پر اپنی توجہ کے چند سکے اس کے مشکول میں ڈال دو۔ میرے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے ڈیڑھ۔ میں تمہیں حاصل کر چکی ہوں۔ تمہاری محبت و چاہت تمام کی تمام میرے نام وقف ہے۔ مجھے ایسے کسی فرد کی ضرورت نہیں ہے۔“ منترہ اس کی بدلتی دلی کیفیت سے بے خبر بڑی وارفتگی سے گویا تھی کہ وہ دل ہی دل میں اپنی پسند پر نام ہو رہا تھا کہ اس کو پائے سکے لیے اس نے کیا کچھ نہ کیا تھا۔

”محبت میں تو بندہ وہی کچھ کرتا ہے جو محبوب کی منشاء ہوتی ہے۔ اس کی پسند و ناپسند، شوق و ذوق حاصل حیات ہوتے ہیں پھر تمہاری یہ کیسی محبت ہے جو تم گھر واری جیسے مقدس فریضے کو عام سے خطابات و رے رتی ہو۔ ہمارے معاشرے میں کامیاب عورت گھریلو عورت کو ہی سمجھا جاتا ہے۔“

”یہ تمہارے منہ میں کس کی زبان بول رہی ہے باسط؟“ وہ گڑبڑاتی تھی۔

”محبت کی زبان منترہ! اس محبت کی زبان جس کو حاصل کر کے تم نے کھودیا اور وریشا نے بیٹھ سکے لیے پالیا۔“

منترہ کے منہ سے مارے حیرت کے کوئی آواز نہ نکلی۔ وہ بھٹی بھٹی آنکھوں سے اس شخص کو دیکھ رہی تھی جو ذرا فاصلے پر موجود تھا مگر دل سے بہت دور محسوس ہو رہا تھا۔

”یہ..... یہ کیا کہہ رہے ہو باسط! میں تمہاری محبت ہوں۔“

”نہیں۔ تم شاید کسی میری محبت نہیں رہی بلکہ تم ایسی مصنوعی چمک تھی جو فنی طور پر مقابل کی آنکھیں بند کر دیتی ہے اور اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ کھرے نور کو کھلنے کی شناخت ہوگی ہے مجھے۔ یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ اب کبھی نہیں ملیں گے اور کسی اتفاقاً کہیں ملے بھی تو اجنبی بن کر گزر جائیں گے۔“

منترہ دھواں دھواں چہرہ لیے اس کو تنگ رہی تھی۔ یہ کیا ہوا تھا۔ ہر باں اچانک نامہرباں بن گیا تھا۔ جن گہری خوب صورت نگاہوں میں اس نے بچے لیے چاہت کے ویپ دیکھے تھے۔ وہاں اب کسی اور کی تصویر تھی۔

”منترہ! محبت تیرا بی ماگتی ہے۔ چاہت و محبت قلبی و بے لوث خلوص ماگتی ہے کیونکہ ہماری زندگی صرف ہماری نہیں ہوتی۔ ہماری خوشیوں پر صرف ہماری حق نہیں ہوتا۔ ہمیں ہنوں کے لیے جینا ہوتا ہے۔ ہماری سہرتیں ہمارے اپنے دوا کر رہے ہیں۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ منترہ کی آنکھوں پر پڑا خود پرستی و خود غرضی کا پردہ سرکٹنے لگا تھا مگر وہ شکست ماننے کو تیار نہ تھی۔

”بلیز باسط! معمولی سی غلطی کی اتنی بڑی سزا مت دو۔ تم جو کہو گے وہی کروں گی۔ مجھے خود سے جدا مت کرو۔ میں مر جاؤں گی۔“ منترہ ہچکچاہٹ رہی تھی۔

”آتم سوری منترہ! میں اس بندھن کو پسند نہیں کرتا جو دل سے نہ جڑا ہوا میرے دل نے تب تک وریشا کے وجود کو تسلیم نہ کیا۔ اس کو محسوس نہ کیا جب تک ایک مضبوط تعلق قائم ہوتا ہے۔“ وہ بھی میں اجنبی بنا رہا تھا۔ آج وہ نہ ہوتے ہوئے بھی میرے ساتھ ہے اور تم کہیں نہیں ہو۔“ وہ دروازہ بند کر کے پلٹ آیا تھا۔ وہ دروازہ صرف گھر کا نہیں دل کا بھی بند کر آیا تھا اور فیصلہ اچانک نہیں ہوا تھا۔ پر سوں جب وہ بتا اطلاق ان کے گھر پہنچا تو وہی ماں بیٹی کو اپنے ان نام نہاد رشتے داروں کے سنگ اس گھناؤنے فعل میں مصروف عمل پایا تھا کہ لمحے بھر کو مارے بغیرت کے انہیں قتل کر دینے کے لیے باز رکھا تھا۔ ملازمہ کا کہنا تھا کہ ان کا کام یہی ہے۔ روز سے لوگ آتے ہیں۔ منترہ اور اس کی ماں کے اس روپ نے اسے بی جی کی ہر بات کا ثابت گردی تھی۔ وہ ملازمہ بھی وہاں مزید کام کرنے پر رضا مند نہ تھی۔ وہ تنخواہ دے کر اسے فارغ کر آیا تھا۔ ان میں سے کسی کو خبر نہ ہو سکی۔ یہی وجہ تھی کہ منترہ کو دیکھ کر اس میں کوئی ایسی خواہش نہیں جاگتی تھی۔ وہ اس پر اب کوئی جذبہ ضائع کرنے کو تیار نہ تھا۔ محبت رہی تھی شہرت کے لیے بھی وہ اس سے کوئی رشتہ قائم کرنے سے گریز کرتا تھا۔ منترہ سے تعلق تو ڈر کر دوا دیوں کی طرح ہلکا پھلکا ہو گیا تھا۔

نیل فون کی بھل نے اسے چڑھا دیا۔ گھر سے فون تھا۔ سلام دعا کے بعد کافی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں اور وہ حرف آواز سے جو اذیت پھٹکار اور ماراٹنگ کا اظہار سنتے کے لیے خود کو تیار کر رہا تھا۔ ان کی مسکراتی آوازیں اس بات کا ثبوت تھیں کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ پھر اگلے ہی پل اس کے اندیشے کی تصدیق ہو چکی تھی جب بھائی کی شوخ رازدارانہ آواز ابھری۔

”خوب آجوائے کر رہے ہو لائف! تمہارے دونوں تنگ میں نے کسی کو کال نہیں کرتے دی کہ تمہارے نور وریشا کی خیمائی میں غل نہ ہو۔ اس وجہ سے بے جی نور ماں جی نے وریشا سے بات کرنے کی ضد نہیں کی اور سناؤ گے وقت گزر رہا ہے؟ ہمارے انتخاب کی دکانیں دو گئے؟ کیا خوب پسند ہے ہماری..... ڈرا بلیز وریشا! فون دو۔ میں صرف مبارکباد دوں گی کہ بالآخر وہ تم جیسے ازل گھوڑے کو نیل ڈالنے میں کامیاب ہو گئی ہے۔“ بھائی کی خوشیاں مڑیں پر تھیں۔ ان کا کھٹکنا تا لہجہ اس حقیقت کا کواہ تھا کہ وہ وریشا سے لاعلم ہیں۔ سخت سردی میں وہ پسینہ پسینہ ہو گیا۔ یہ سوچ کر اگر وہ وہاں نہیں گئی تو کہاں گئی ہے؟ پچھلے ماہ اس کے والدین اپنے بیٹے بیٹے کو ہر گھڑی ساتھ چلے گئے تھے اور اس کی بہن بھی دہلی میں مقیم تھی پھر کہاں جا سکتی ہے؟ اس سوال نے اسے چکرا کر رکھ دیا۔ وہ گھومتا ہوا سا پکڑ کر بیٹھ گیا۔

”باسط..... باسط! تم خاموش کیوں ہو وریشا کو بلاؤ۔“ بھائی کی آواز ابھری

”بھائی! اور وریشا یہاں نہیں ہے۔ وہ دن قبل کراچی کے لیے روانہ ہو چکی ہے۔“ یہ یقین کر کے کہ بھائی تھپاہیں وہ کہہ بیٹھا۔ جواہر ان کی بوکھلائی ہوئی آواز تھی۔

”باسط..... یہ کیا کہہ رہے ہو.....؟ وریشا کہہ رہی تھی کہ تم لوگ، بھائی مون ٹور پر کاغان کا لام وغیرہ جارہے ہو۔“ باسط سمجھ گیا۔ یہ سب اس نے اس لیے کہا کہ وہ ان دونوں میں منترہ سے شادی کرنے کا ارادہ کر رہا تھا اور اس نے انہیں پریشانی سے بچانے کے لیے یہ سب کیا۔

”بھائی! میں آج ہی کراچی آ رہا ہوں۔ وہاں بیٹھ کر تمام گفتگو بتاتا ہوں۔ میں ابھی گھر نہیں آؤں گا کیونکہ مسئلہ بڑھ جائے گا۔ آپ کسی فریڈ کا کہہ کر وہاں گھسٹن والے پارٹمنٹ میں آجائیں۔ میں جلد پہنچ رہا ہوں۔“



”اب کہاں ڈھونڈ میں اسے.....؟ تم سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے باسط۔ یہ سب کرنے سے قبل کم از کم مجھ سے ہی پوچھ لیتے تو یہ سب نہ ہوتا جو ہوا۔“ اسے کراچی آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ اس دوران وہ ہر ممکن کوشش کر چکا تھا اور وریشا کو تلاش کرنے کی اور نا کام رہا تھا۔ بھائی اس کٹھن گھڑی میں اس کے ساتھ تھیں۔ انہوں نے ہی ڈھونڈ کر رشتہ کا ایڈریس معلوم کیا مگر وہاں سے بھی ناکامی ہوئی تھی کیونکہ جس دن باسط یہاں پہنچا تھا اسی دن وہ کینیڈا کے لیے روانہ ہوئی تھی مگر وہاں کا کمیونٹک نمبر وہ حاصل نہ کر سکی تھیں۔

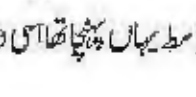
”آپ کو پہلے سے معلوم تھا؟“ اس کے دھجے لہجے میں استعجاب تھا۔

”ہاں۔ یہ کوئی دھکی چھپیں بات تھوڑی تھی۔ وریشا کا فیملی بیک گراؤڈ ہم سے چھپلا نہیں گیا تھا کیونکہ وریشا عاقب کی حادثاتی موت کے بعد کسی سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس کے خیال میں یہ اس سے منسوب ہونے والے شخص کے ساتھ انصافی و جرم تھا کہ جو محبت وہ عاقب سے کرتی تھی۔ اس محبت کا اظہار وہ کسی دوسرے سے کرے۔ یہ اس کی اپنی منطقی سوچ تھی جو گھر والوں کے لیے قابل قبول نہ تھی۔ وہ سمجھتے تھے ابھی جذباتی عمر ہے۔ کل جب یہ دور گزر جائے گا تو وہ ہاتھ ملتی رہ جائے گی۔ جانے والے جاتے ہیں کبھی نہ لوٹ کر آنے کے لیے۔ پیچھے رہ جانے والوں کو بھی صبر آ جاتا ہے۔ اس کے والدین کو معلوم تھا وہ جلد سنبھل جائے گی۔ اس کے لاکھ انکار و مخالفت کے باوجود انہوں نے اس کی شادی کر دی۔ ادھر تم ماں اور بے جی کے دباؤ میں آ کر شادی تو کر بیٹھے مگر سمجھتے نہ کر سکے پھر سب تمہارے سامنے ہے۔ عاقب صرف منگیتر تھا اور تم مجازی ضد۔ ایک طرف تمہارا بیٹا جاگتا زندگی سے بھرپور وجود تھا دوسری جانب نظروں سے کوٹھل مٹوئی تلے دیا ہوا مردہ وجود۔ زندگی کے طالب زندہ لوگ ہوتے ہیں پھر عورت کی حقیقی محبت شادی کے بعد شروع ہوتی ہے جو زندہ رشتہ تم سے وریشا کو ہو سکتی تھی۔ خود سوچو اگر وہ عاقب کی محبت میں مبتلا ہوتی تو تم سے نور اجان چھڑا سکتی تھی۔ تم نے کیا کچھ نہ کیا اس کے ساتھ اور وہ رشتہ داشت کرتی رہی۔ صرف اس لیے کہ تم اسے علیحدہ نہ کرو چھوڑ دو۔“

”بھائی! کیا وہ مجھ سے محبت کر سکتی ہے؟ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی..... میں نے بہت پریشان کیا ہے اسے بہت ڈپا بہت ستایا ہے..... اور..... اور اسے گالی بھی دے ڈالی۔“ سرخ آنکھیں، بکھرے بال پریشان علیہ ان چند دونوں میں وہ اپنی مدد بدھ کھو بیٹھا تھا۔

”عورت سب کچھ برداشت کر سکتی ہے مگر مرد کے لبوں سے نکلا ایک بے اعتمادی کا جملہ اس کی خودداری و عزت نفس کو کھال کر دیتا ہے۔ وہ ایسی کوئی بات برداشت نہیں کر سکتی جو اس کی روح کو زک پہنچائے۔“

”وہ مجھے ایک دھچکا دے جائے۔ میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔ بدلے میں جو سزا دے گی مجھے منظور ہوگی۔ وہ ایک بار آ جائے۔ میں منالوں گا اسے کہاں گم ہو گئی ہے۔ ایک بار آؤ تو دے مجھے میں خود اس تک پہنچ جاؤں گا۔“ وہ پورے خاندان میں اپنی وجاہت کھڑ مڑا دی و بددعا کی کے باعٹ مشہور تھا۔ گھر والے بھی اس سے بات کرتے وقت احتیاط کرتے تھے۔ نقطہ بے جی تھیں جو اس سے متاثر نہ ہوتی تھیں۔ ایک ہفتے سے اسی بددعا و اکھڑ مزاج شخص کو وہ از حد لول و امر وہ دیکھ کر رنجیدہ تھیں۔



”بھئی! اور وہ زندہ نہ کرلو۔ پریشان مت ہونا۔ مجھے مارکٹ سے آنے میں دیر ہو جائے گی۔“ نوانے برقعے کے ٹخن بند کرنے کے بعد پلاسٹک کی باسکٹ اٹھائی۔ اسے تلقین

کرتے ہوئے دونوں غلاب پھرے پر گر کر وہ دروازے سے باہر نکل گئی تھیں۔ اس نے دروازہ بند کر کے پردہ ہار کھینچا اور اٹھ کر گھن کی صفائی کرنے لگی۔ محسن کے وسط میں آسمان کا درخت تھا۔ موسم نہ ہونے کے باعث پھل تولد کر رہا تھا مگر پتوں سے جلد ہی آگنیں پھرنے لگتا اور وہ اسی طرح جھاڑو اٹھا کر صفائی میں جمت جاتی تھی۔ جھاڑو سے کر تمام پتے اکٹھا کر کے اس نے ڈسٹ بن میں ڈالے۔ سائیز میں لگنل سے پائپ لگا کر پورا گھن دھوا ڈالا۔ ولیدر لگانے کے بعد اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی جہاں فرش پر کچھی دری کے اوپر سفید براق چاندنی چھٹی ہوئی تھی، جس کے کناروں میں پھول دار رنگین کپڑوں کے خلاف گاؤں کیوں پر تھے۔ کمرے کے دوسرے حصے میں نماز کی جگہ تھی اور اوپر ایک میں قرآن پاک رکھا تھا۔ ایک کے کمرے سے آف وائٹ تیلچ لٹک رہی تھی جو اندھیرے میں مشعلوں کی طرح چمکنے لگتی۔ روشنی میں اس کا رنگ ایسا ہی رہتا تھا۔ کمرہ صاف تھا۔ وہ محسن کے سائیز میں بنے کچن میں آگئی۔ دوپہر کا پکا ہوا آلو قیہ موجود تھا۔ اس نے آٹا کووندہ کر رکھ دیا۔ عصر کی نماز سے فارغ ہو کر روٹیاں پکا گئیں۔ چائے تیار کی تاکہ نوا کے آتے ہی چائے لے آئے۔ عصر کے بعد مغرب کی نماز سے وہ فارغ ہوئی تو اس کا دل گھبرائے لگا۔ ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ وہ دیر ہو جانے کا کہہ کر گئی تھیں مگر اتنی دیر گسی نہیں ہوئی تھی۔

آج سردی بھی زیادہ تھی۔ کوئلہ کی تیز ہولوں نے کراچی کو پیٹ میں لے رکھا تھا۔ رات کو تیزی سے پھسلنے و گھلنے کر وہ حد خواست تھی اور سوچ رہی تھی کہ کیا کرے؟ اسی دم باہر کا درکنے کی آواز آئی تھی۔ وہ بھاگ کر دروازے پر گئی۔ باہر سے آئی ہوئی آواز اس کا اس کے بدحواس دل کو تسلی ملی تھی۔

”کہاں چلی گئی تھیں؟“ وہاں یہاں فکر کے مارے میرا حال ہو رہا ہے۔۔۔۔۔“ ان کی دھتک پر دروازہ کھولتے ہی وہ مخاطب ہوئی مگر ان کی پیشانی اورانگ پر بندھی بیٹوں نے اسے پریشان کر ڈالا۔

”کیا ہوا یہ بیٹھیں کسی ہیں؟“ وہ ہمارا دے کر اندر لاتے ہوئے کویا ہوئی۔

”معمولی سی چوٹیں ہیں، جی اسڑک پار کرتے وقت ایک کار سے ٹکرائی تھی۔“ وہ پلنگ پر بیٹھتے ہوئے بتانے لگیں۔

”یہ کار والے بھی اسڑک کو اپنی جا گیر سمجھتے ہیں۔“ انکھیں بند کر کے چلاتے ہیں۔ ”وہ ان کے سر ہانے تکیر رکھتے ہوئے غصے سے بڑبڑاتی تھی۔

”جی! غلطی میری تھی۔ وہ بے چارہ تو بہت شریف لڑکا تھا۔ بہت پریشان ہو گیا تھا۔ بڑے اسپتال میں لے کر گیا تھا مجھے۔ منٹوں میں ہزاروں روپے خرچ ہو گئے اس کے۔“ پرائیویٹ اسپتال والے کس طرح کھال کھینچتے ہیں۔ میرے منع کرنے کے باوجود کئی ٹیسٹ کروائے۔ ایکس رے لٹراساؤنڈ۔۔۔۔۔ کیا کچھ نہ کر ڈالا انہوں نے روپے سینے کے چکر میں اور وہ بچہ بتا منہ بتائے اور ایگنی کرنا گیا۔ دوا کیں بھی اتنی ہنگی دی ہیں کم کھنوں نے یوں دیر ہو گئی۔“ اب صاحب تک جا گئی رہیں اس لڑکے کو دعائیں دیتی رہیں جس نے ان پر فوٹو آٹھ ہزاروں روپے ہر ہار دے دیے تھے۔ وہ ان کے برہمروالے پلنگ پر لیٹی ان کی سادگی پر مسکرا رہی تھی۔

برائیاں چوٹیں اور تکلیف نہیں دیکھ رہیں۔ اس کی خاموت دیکھ رہی ہیں۔ بڑھاپے کی چوٹ معمولی سی بھی بہت تکلیف دیتی ہے۔ تو اس سرگرم میں آگڑی گئی تھیں۔ بھار لگ ہو گیا تھا۔ وہ ان کو ناشتہ اور دوا دے کر محلے کے پارہ پڑھنے والے بچوں کو سبق دے رہی تھیں جب باہر دروازے کے پاس کسی کار کا ہارن بجتا تھا پھر کچھ دیر بعد دروازے پر ہلکی سی دھتک ہوئی تھی۔ اس نے اندازے سے بچے کو باہر بھیجا جس نے فوراً آکر اطلاع دی۔ ”اُسے کوئی ملنے آیا ہے۔“ اس کے کچھ کہنے سے قبل دو اخوند گھڑائی ہوئی کمرے سے باہر آگئی تھیں اور اس بچے سے اس نواد کو اندر بلوایا تھا۔ وہ اس دوران پردے میں ہو گئی تھی۔ مضبوط جوتوں کی ٹھک ٹھک اندر جا کر معدوم ہو گئی تھی۔ وہ پردے سے نکل آئی تھی اور گرم صم انداز میں اس چھوٹے سے محسن میں پھیلی کلوں کی خوشبو محسوس کر رہی تھی۔ کتنی جانی پہچانی شناسائی تھی یہ مہنگ۔۔۔۔۔

”ہنس۔۔۔ وہ اس چھوٹے سے گھر میں کیوں آنے لگا۔ وہ شاید اپنی محبت کے سنگ زندگی کی حقیقی سرسبزیں کشید کر رہا ہوگا۔ شادی کر چکا ہوگا۔“ ان آنکھوں پر مہنگ پر ہنسنے والے دل کو اس نے سرزنش کی تھی اور مہمان کے لیے چائے بنانے یا درپیشی خانے کی طرف بڑھ گئی۔

”آپ نے یہ تکلیف کیوں کی بیٹا! کل کیا کمر خرچ کیا ہے مجھ پر جواب یہ اتنا سامان اٹھا کر لے آئے۔“ اب اس کی باسکٹ کل کار میں ہی رہ گئی تھی جواب وہ لے آیا تھا۔ مختلف شاپرے پھری ہوئی۔ اب انکساری سے کہہ رہی تھیں۔

”شکر ہے ماں جی! کوئی فریج کچر نہیں ہوا ہے۔ میں تو کہتا ہوں آپ ایک ہفتے باسٹل میں ایڈمٹ ہو جائیں۔ باگل ٹھیک ہو جائیں گی۔“

”جگ جگ چوبیٹا! میں ٹھیک ہوں پھر اپنی جوانی کی کوئیے چھوڑ کر جاسکتی ہوں۔“ اس لمحے ایک بچی بڑے میں دو کپ چائے لائی۔ ایک کپ ٹہایت اب سے اس کی طرف بڑھایا اور دوسرے کو دے کر چلی گئی۔

کافی دنوں بعد چائے کی وہ مہنگ آئی تھی جس کو وہ ڈھونڈ رہا تھا۔ چائے کے باوجود اس نے بے اختیار کپ پیکی سے نیا اور لیوں سے لگا لیا۔

وہی کشیدہ ذائقہ تھا۔ ایک کے بعد ایک گھونٹ وہ پیتا چلا گیا کسی نہ بدے کی مانند۔ اب اس کا کپ ہاتھ میں تھا اور اس نے کپ خالی کر دیا تھا۔ طمانیت آمیز تسکین دہک رنگ میں مانی چلی گئی۔ ”اُسے کپ پر نگاہ پڑی تو وہ حواسوں میں پلٹا اور شرمندہ سا اٹھ کھڑا ہوا۔

”ماں جی! مجھے دیر ہو رہی ہے۔ آپ ان دواؤں کے ساتھ فروٹ اور جوس ضرور لیجئے گا۔ میں کل آؤں گا آپ کی طبیعت معلوم کرنے۔“ پردے کی کوٹ سے جھانکتی نگاہوں میں بے یقینی و تحس نے دور تک اس کا پیچھا کیا۔ دور تک اس کے لیے بہت طویل و بھاری تھی۔ اب اسکٹ میں سے شاپر نکال کر اس کا لایا ہوا سامان دیکھ رہی تھیں۔ فروٹ جوس کے ڈبے بڑے بڑے، لیکن نرید چلی ڈرائی فروٹس، سسکنس بے حساب سامان تھا۔ اب اس کی شان میں زمین و آسمان کے قلابے مار رہی تھیں۔ اس کے خاموش بیٹے آنسوؤں سے بے خبر جو اندر ہی اندر دھسک رہی تھی۔



ڈرائیو ر سے لیٹر پورٹ چھوڑ گیا تھا۔ کراچی پہنچ کر وہ سیدھی یہاں چلی آئی تھی۔ اب اس نے قرآن پاک پڑھا تھا۔ ان کے گھر کے عقب میں قائم یہ کچی بستی اسنے سال گزرنے کے باوجود بسکی تھی۔ نہ یہاں کے حالات بدلے تھے نہ یہاں کے مکتوں کے دل۔۔۔۔۔ چھوٹے چھوٹے کچے پکے گھر ہیں میں رہنے والے۔ یہاں کے لوگوں کے دل بڑے کشادہ و شفاف تھے۔ اب اس کوئی اولاد تھی چند سال پہلے وہ بیوہ ہو گئی تھیں۔ میاں ان کے دوکان میں چھوڑ گئے تھے جن کے کرائے سے انھیں گزار بسر ہو رہی تھی۔ اپنی زندگی انہوں نے شروع سے بچوں کو سارا قرآن پاک پڑھانے کے لیے وقف کر رکھی تھی۔ کوئی اولاد نہ ہونے کے باوجود ان کا آئین بچوں سے بھرا رہتا تھا۔ ان کے پاس نہ صرف اس محلے کے بلکہ ان کی وضع داری و نیک نامی دیکھ کر اس پاس کے بنگلوں کے بچے بھی درس قرآن لینے آتے تھے۔

اب اسے توجہ سے اس کی داستان سنی تھی اور کچھ عرصے صبر کرنے کی تلقین کی تھی۔ آج پورے دو ہفتے بعد اس نے باسٹ کو دیکھا تھا۔ وہ اسے بہت مختلف و گمزور محسوس ہوا تھا۔ وجہ یہ پھرے پر کچھ کھونٹے کا احساس تھا۔ خطرہ اب وائٹنٹا اس کی چال سے عیاں تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ ہماری رات مختلف حوالوں میں بسر کی۔

وہ دوسرے دن بھی حاضر تھا۔ بہت سارے شاپر کے ہمراہ۔ اب اسے سختی سے منع کر دیا کہ انہیں یہ سب پسند نہیں۔

اس دن وہ دو کپ چائے کے پی کر گیا۔ ہاتھ میں باٹون چاکلیٹس کے پکٹ لیے۔ اب کو بتایا کہ وہ ان کے شاگردوں کے لیے لایا ہے۔ اب کو زبردستی چیک اپ کے لیے اسپتال لے کر گیا۔ اب اس کی ٹھنی میں تھیں ہی پڑھنے کے لیے آئے والے بچوں کو بھی دہر ویدہ بنا چکا تھا۔ اس کی آمد وقت بڑھ گئی تھی۔ اب اس کے منع کرنے کے باوجود وہ ہاتھ میں کچھ نہ کچھ اٹھائے چلا آتا جن میں سرنہر مست بچوں کی چیزیں ہوئیں اور جانے سے قبل وہ ان کو کار میں ایک راؤنڈ سیر ضرور کراتا۔ جیتوتا چائے اس کے آنے کی دعا کیں مانگتے اور کار کا ہارن سننے ہی بھاگتے۔ وریشا کو سمجھ نہیں آ رہی تھی اس کی حد سے بڑھتی بے تکلفی کا مقصد کیا تھا اور وہ کیا یہاں منہ کو لے آیا تھا؟ اگر لے آیا تھا تو وہ اسے اتنے گھنٹوں تک کس طرح آواز چھوڑ رہی ہے۔ اس کی آمد وقت کے ساتھ ساتھ اس کے اندر بڑھتے سوالوں کی یورش پھیل رہی تھی۔ باسٹ سے اس کا سامنا ابھی تک نہ ہوا تھا۔

وہ اس کی موجودگی میں باورچی خانے سے باہر نہیں نکلتی تھی۔

اس دوران اتنی بے تکلفی بڑھ گئی تھی کہ وہ اکثر کھانا بھی وہاں کھانے لگا تھا۔

”اب ایک بات کہوں؟“ وہ ان کی چوٹی باندھتی ہوئی سچیدگی سے بولی۔

”اجازت کی کیا ضرورت ہے ضرور کہو بیٹی۔۔۔۔۔“ وہ شفقت سے کویا ہوئیں۔

”وہ۔۔۔۔۔ باسٹ صاحب۔۔۔۔۔ بہت آٹے لگے ہیں۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے میری یہاں موجودگی۔۔۔۔۔ لوگ کیا باتیں نہیں بتائیں گے؟“ وہ جھجکتے ہوئے مدعا بیان کر رہی تھی۔

یہ گھر اس کا نہیں تھا۔ وہ خود یہاں آئی تھی اور وہ کس طرح انہیں پابند کر سکتی تھی کسی کو بلا نے پر۔

”میں جانتی ہوں بیٹی اہم جو کہنا چاہ رہی ہوں۔ دیکھو بیٹی! اول تو وہ لڑکا بہت شریف و نیک ہے۔ میں نے کبھی بھی اس کی نظروں کو ادھر ادھر پھٹکتے نہیں دیکھا۔ میرے سامنے بھی کجا ہیں جھکا کر بیٹھا رہتا ہے اور میری لوگوں کی بات تو لوگ خود اسے پسند کرتے ہیں۔“

”کیوں۔۔۔۔۔؟“ یہ اطلاع اس کے لیے حیرت انگیز تھی۔

”وہ لڑکا فرشتہ ثابت ہوا ہے ہمارے لیے۔ ایسے مبارک قدم ہیں اس بستی میں پڑنے ہی کو یا سب کچھ سنوٹنا جا رہا ہے۔“ اب اس کی تعریفوں کی پوٹلی کھول چکی تھیں۔ ان کی زبان رواں دواں تھی۔

”بہتی کے لوگوں کے لیے مجھ تعمیر کروا رہا ہے۔“

”مجد یہاں پہلے سے موجود ہے پھر۔۔۔۔۔“

”بہت چھوٹی مسجد ہے۔ رمضان شریف میں لوگوں کو پریشانی ہوتی ہے۔ کئی بے روزگاروں کو ملازمتیں دلواتی ہیں۔ پانی کا مسئلہ حل کر دیا ہے اور یہ بستی بھی کچھ عرصے بعد لیز کروا دے گا وہ۔۔۔۔۔ کہہ رہا تھا اعلیٰ حکام سے بات چل رہی ہے۔ جلد ہی مسئلہ حل ہو جائے گا۔“ اب سرشار تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی یہ کیا پلٹ کس طرح ہوئی؟ اپنی ذات کے لیے جیسے مرے والا شخص جس کے نزدیک صرف اس کی خوشیاں و خواہش حاصل زبست تھیں، خود تو نے اس میں مہارت کے درجے پر فائز تھا جس نے کس طرح ذلیل و خوار کر کے اسے وہاں سے نکالا تھا۔۔۔۔۔ آج کس طرح کس کی خاطر یہ سب گزر رہا تھا جو اس کا شیوہ تھا۔

”میں نے کہا بھی بیٹا اہم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟ یہ تم غریبوں کا دل در ہے۔۔۔۔۔ دو دو جہاں سالوں سے کچھ نہیں بدلا وہ تم کیوں کہہ بدلی پاؤ گے؟“ اب اس کے جاری تھیں۔

”وہ بولا مانی میں دعاؤں کا سنتی ہوں۔ نیکیوں کا طلب گار ہوں میں یہ سب اس لیے کرتا ہوں کہ مجھے کسی کی تلاش ہے۔ میرا کچھ کھو گیا ہے۔ آپ دعا کریں میں اسے پاؤں گا۔ میری کوئی چھوٹی سی نیکی حاصل مراد تک پہنچا دے گی۔“ وریشا کا دل دھڑک اٹھا۔ وہ بولی۔

”ہوا! آپ نے پوچھا نہیں اسکی کیا چیز ہے جس کی انہیں تلاش ہے؟“ اس کے اندر ایک انجانی سی کھلبلی چلی تھی۔

”دل تو بہت چاہا پوچھوں مگر جواب آئے آگیا۔“ تھینا وہ کوئی خاص اور ایسی چیز ہوگی جو یہاں نہ ملتی ہو ورنہ وہ اتنے اصرار پر نہ ہونگی سے ہنگی چیز خریدنے میں بھی تردد نہ کریں۔“

”نہی کیا چیز ہو سکتی ہے جس کا نام تبدیل نہ ہو؟ کیا باسط اور مزہ کے درمیان کچھ ہوا ہے؟ کیا مزہ روٹھ کر کہیں چلی گئی ہے جس کی تلاش میں وہ سرگرداں نیکیاں کر رہے ہیں۔ دعا میں سمیٹ رہے ہیں۔۔۔۔۔ دل میں کسی خوش فہمی کو جگہ مت دووریشا۔ تم کتنی نادان کتنی کوڑھ مغر ہو۔ ہر بار اس شخص کی زیادتیاں بھلا کر اس سے اچھائی کی توقع کرتی ہو۔۔۔۔۔ وہ تمہاری تلاش میں نہیں ہے۔ اسے تمہاری جستجو نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ اسی وقت تمہاری یہاں موجودگی محسوس کر لیتا جس طرح تم نے اس کے قدموں کی آہٹوں سے لمبوس کی مہک سے اسے پہچانا تھا۔“ وہ خود سے الجھ رہی تھی۔ بول کے لب مسلسل حرکت میں تھے۔

”میں سوچ رہی ہوں بنی باسط میاں سے تمہارے خاوند کا پتہ کرواؤں۔ کیا نام ہے تمہارے خاوند کا۔۔۔۔۔ کبھی تم نے بتایا نہیں۔۔۔۔۔؟“

”چھوڑیں بوا کیوں کسی کو پریشان کرتی ہیں۔ ان کو اتنا ہوگا تو خود ہی آ جائیں گے۔“ وریشا نے کول مول جواب دیا۔

”معاف کرو بیٹی! اگر تمہارا خاوند غلط جتو آدھی غلطی تمہاری بھی ہے۔“

”یہ کیا بات ہوئی بوا میں نے صبر کیا۔ برداشت کیا بیسری غلطی ہے؟“ نہ معلوم کس احساس تلے وہ رو پائی ہوگی۔

”ہاں۔ جب وہ دوسری عورت کے متعلق باتیں کرتا تھا تو تم نے کیوں اسے روکا نہیں؟ کیوں خاموشی سے راستہ صاف کرتی چلی گئیں؟“

”ہم زبردستی کسی کو محبت کرنے پر مجبور کس طرح کر سکتے ہیں؟“

”وہ کوئی غیر نہیں تمہارا خاوند ہے۔ میاں بیوی کے درمیان غیریت نہیں ہوتی۔ وہ پیچھے ہٹا تھا۔ تم آگے بڑھ جاتیں تو زبوتیں اپنے جھوٹے غرور کو۔ مرد ہمیشہ سے خوب صبر تو حسن کا سیر رہا ہے۔ اگر تم ایسی بے وقوفی نہ کرتیں تو وہ کب کا اس عورت کو بھول کر تمہارا کین چکا ہوتا۔“ بوا اب اسے سبق پڑھا رہی تھیں۔

”اس نے مجھے گھر سے نکالا گالی دی میرے گردوار پر ٹک کیا۔ یہ سب میں کس طرح بھول سکتی ہوں بوا۔ ایک عورت کا اصل رُخ اور اس کا گردوار ہوتا ہے۔“ وہ بے اختیار رونے لگی۔ بوائے سینے سے لگایا سمجھایا پیار کیا پھر بولیں۔

”میں جانتی ہوں یہ سب برداشت کرنا بہت مشکل ہے مگر میری بیٹی ایسا سوچنے کا بھی تم نے ہی موقع دیا۔“ خیر جو ہونا تھا ہو گیا مگر میرا دل کہتا ہے وہ پلٹ کر ضرور آئے گا اور اس کی سزا یہ ہوگی کہ تم اسے معاف کر دینا۔ اس کا خمیر اسے تا حیات تمہارے آگے دکھانا تھا۔ دے گا۔“

سپارہ پڑھنے والے بچے سلام کرتے ہوئے اندر آگئے تھے جن کے لیے اس نے پہلے کھن میں درزی بچھا دی تھی۔ وہ چٹلیں ایک طرف اتار کر درزی پر بیٹھ گئے تھے۔ پیچھے وہ چلا آیا۔ بہت سارے غبارے اور چاکلیٹس لیے ہوئے۔ اس نے بچوں میں بافیاں اور غبارے تقسیم کرنا شروع کر دیے تھے۔ بچوں کے چہروں پر خوشی دیدنی تھی اور وہ پردے کی ٹوٹ سے اس کے سر جھائے ہوئے چہرے کو دیکھ رہی تھی جہاں بے سکونی و اضطراب ڈھکتا ہو کر رہ گئے تھے۔ بوا اسے اندر لے گئی تھیں پھر اگلے قدموں ہی واپس آئی تھیں۔

”شامی کباب تیار ہو گئے؟ باسط میاں کہہ رہے ہیں بڑی لذیذ خوشبو آ رہی ہے۔“ بوا اس سے مخاطب ہوئی تھیں۔

”ہاں تیار ہیں۔“ کباب پلپتے ہوئے بولی۔

”تم اتنے میں رات نہ بنا لو میں پرانے بناتی ہوں۔“

”وہ پرانے نہیں کھاتے۔ میں بڑی سلیک ویٹی ہوں۔“ اس نے بے ساختہ کہہ دیا۔ چورنگا ہوں سے بوا کی جانب دیکھا تو وہ اپنے آپ میں گم تھیں۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اس دن بھی انہوں نے پراٹھا نہیں کھلایا تھا۔ جلدی سے تیار کر کے بھیج دو اندر۔ یہ میرے نصیب ہیں۔“ پہلے تم جیسی لڑکی نے میری کیا کوئل بنادیا۔ لب باسط میاں نے اُنی عزت دے کر سرخو کر دیا ہے۔ محلے میں سب مجھے رشک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔“ شدت جذبات سے ان کی آواز بھرا گئی تھی۔ وریشا نے بڑی عقیدت سے ان کے آنسو صاف کیے تھے۔

باسط بڑی حیران کن نگاہوں سے اپنے آگے رکھے اس نے کو دیکھ رہا تھا۔ جس میں بلینوں کے اندر کباب سلاؤں چپیں اور کچپ ایک مخصوص انداز سے رکھے تھے اور یہ انداز ان مخصوص ہاتھوں کا تھا جو کھوکھے تھے۔ بوا اسے کھانے کی تلقین کر کے کھن میں بچوں کا سبق سننے چلی گئی تھیں۔ وہ کھاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ بوا کی بیٹی اور وریشا کی بچہ یکساں لگتی ہے۔ خاموش رہتا۔ گھر چکا کر رکھنا کھانے لذیذ بنانا اسے یہاں آتے ہوئے کئی دن گزر گئے تھے۔ نہ معلوم کیا وجہ تھی کہ وہ اس چھوٹے سے گھر کی جانب کھنچا چلا آتا تھا۔ یہاں آ کر اس کے اضطراب دل کو طمانیت ملتی تھی۔ کھویا ہوا فقر ملنے لگتا تھا۔ دل دوسرا غر چھائی وہاں اس کی خوشبو ان کی بچی درہ دیواروں سے پھونکتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ اس کا دل کہتا وہ نہیں کہیں ہے۔ اس کی خوشبو اس کی خاموشی اسے صدا کی دیتی تھیں اور وہ سب بھول بھال کر کشاں کشاں یہاں بھاگا چلا آتا اور سب بھول جاتا تھا۔

بوا کی سادگی و صروت سے پھر پورا میں اسے اٹھی لگتیں پڑھنے والے بچوں سے وہ خاموشی حد تک نفی ہو گیا تھا۔ بچوں کے ساتھ شرا نہیں کر کے وہ خود بھی جینے کی امنگ پیدا کرتا تھا۔ ابھی صبح اس سے میل فون لے کر گیا ہوا تھا۔ وہ اس کے کمرے سے عام کے پیر پر آنے والے پردوں کی تصویر کھینچتا تو کبھی دیوار پھاندنی ملی اس کے کمرے کی زد میں آتی تھی۔

وریشا کی تلاش میں ناکامی کے بعد بھابی نے کہا تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ نیکیاں کرے مجبور بے بس لوگوں اور معصوم بچوں کی دعائیں لے کیوں کہ کبھی کبھی ضائع نہیں جاتی دعائیں کبھی نہ کمی ضرور قبولیت کا درجہ پاتی ہیں تب سے اس نے ایسے بہت سے فلاحتوں ہوو کے کام شروع کر دیے تھے۔

”انکل بہت ساری تصویریں لے کر آیا ہوں۔“ چھ سالہ صبح خوشی خوشی اندر آ کر اس سے کویا ہوا تھا۔

”اچھا۔۔۔۔۔ یہ بڑے یاہر وے کر آؤ پھر تصویریں دیکھتے ہیں۔“ وہ بیل فون اس کے ہاتھ سے لے کر بڑے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ صبح بڑے لے گیا۔ وہ تصویریں دیکھنے لگا۔ بڑی مزاحمتی تصویریں کھن میں بیٹھے بچے نمایاں تھے۔ کچھ تصویروں میں بوا بھی موجود تھیں پھر ایک تصویر پر اس کی نگاہیں اٹھی گی اٹھی رہ گئیں۔ وہ بے اختیار اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی وقت صبح اندر داخل ہوا تو وہ پوچھنے لگا۔

”بیٹا یہ۔۔۔۔۔ یہ کیوں ہیں؟“ اس نے سوبائل کی اسکرین پر نگاہ رکھ کر کہا۔

”یہ باجی ہیں۔ میں نے چھپ کر یہ تصویر لی ہے۔ یہ آپ کو دیکھ کر پردے میں چھپ جاتی ہیں۔ بوا کو آپ نے دیکھا ہے۔ باجی کو نہیں دیکھا اس لیے۔“ صبح کی بات مکمل ہونے سے قبل ہی وہ چپ چاندنی پر بندے پر گر گیا تھا۔

اس کی نیکیاں رائجاں نہیں گئی تھیں۔ اس سب کریم نے اپنی رشتوں کی بارش اس پر اس انداز میں کی تھی کہ جلد دعائیں مقبول ہوتی تھیں۔ صبح اسے اس طرح سجدے میں دیکھ کر سمجھا کہ وہ گر گیا ہے۔ وہ بھاگ کر بوا کو بلا کر لے آیا۔ پاپٹی کا پتی بوا گھبرا کر اندر آئی۔ ان کے پیچھے تمام بچے اور بچوں کے پیچھے خوفزدہ سی اڑی اڑی رنگت والی وریشا تھی۔ وہ سجدے سے اٹھ گیا تھا۔ اشک دعا مت اس کی آنکھوں میں تھے۔ بچوں کو بوائے چھٹی دے دی۔ باسط کے شرمسار و نام انداز میں حرف دہشتان سنی اور فیصلے کا اختیار وریشا کے ہاتھ میں دیا تھا۔

کمرے میں گوبیر خاموشی تھی۔ وہ دونوں آئے سائے بیٹھے تھے۔ باسط اسے منانے کے لیے نکاحیت دل سنانے کے لیے لفظوں کو ترتیب دے رہا تھا اور وہ گردن جھکائے آنسو بہا رہی تھی۔

”وریشا! اس نے محبت سے بخورنگا جس اس کے صبح چہرے پڑا لے ہوئے کہا۔ وہ خاموش رہی تھی۔

”جو ہمارے ساتھ گزرا وہ کبھی تا حیات ہماری زبان پر نہیں آئے گا۔ اس وقت کو ایک ڈراؤنا سپنا سمجھ کر بھول جاؤ۔ میں نے جو تمہارے ساتھ کیا اسے اگر معاف کر سکتی ہو تو کرو۔۔۔۔۔ ورنہ میں ہر سزا بھگتے کو تیار ہوں۔“ وریشا خاموش رہی تو وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

”جانتا ہوں۔ میرا جرم قابل معافی نہیں ہے۔ میں نے بہت کم ظفری و بے حسی کا ثبوت دیا تھا مگر تم سے دوری اور تمہاری تلاش نے مجھ سے پھر پورا تقاضا لیا ہے۔ لہذا تڑپا ہے۔ تم بے جی کے پاس کیوں نہیں گئیں؟ اگر اللہ پر ہمیں اس طرح نہ ملاتی تو۔۔۔۔۔ یقین مانوں میں زندہ نہیں رہ پاتا۔“ اس کی نگاہوں میں محبت کی صداقت تھی۔ پھر محبت تو بذات خود ایسا جذبہ ہے جو اپنا آپ منوار کر چھوڑتا ہے۔ وہ اس کے جذبول تک رسائی حاصل کر چکی تھی۔ اب اس کی جاہت کی چاندنی صرف اس کے لیے تھی۔ ساری جنگلی و کدورت صاف ہو چکی تھی۔ اس کے لبوں پر یوں بعد وہی زندگی سے پھر پور مسکراہٹ نمودار آئی تھی جس نے اس کے چہرے کو پورے وجود کو منور کر ڈالا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا۔ لب وہ دادی جان کی دعاؤں کے حصار میں آگئی تھی۔ رونے کے دن گزر گئے تھے۔ اب ہنسنا تھا۔

”میں ہر سزا نے کو تیار ہوں۔ پلیز مجھے معاف کر دو وریشا۔“

اس کی خاموشی اسے متوشش کر رہی تھی۔

”بیٹی! اگر صبح کا بھولا تمام کو گھر لوٹ آئے تو دروازے کھول دیجیے ہیں مگر انہیں کرتے مان جاؤ معاف کر دو۔ بھلا معافی سے بڑھ کر اور سزا کیا ہوگی قصور وار کے لیے۔“ بوا اندر آ کر کھیا ہو گئیں۔

”ہوا! آپ میری طرف ہیں یا ان کی طرف؟“

”وہ کہتے ہیں نہ فتنی فتنی۔“ بوا کے انداز پر بیٹوں کے قہقہے کو بخ اٹھے تھے۔

